

گلدستۂ درویشان کے

وہ پھول...... جو مرجھا گئے

حصہ اول

چودھری فیض احمد گجراتی درویش
ناظر بیت المال آمد۔ قادیان

مصنف: .... چودھری فیض احمد گجراتی درویش قادیان

ناشر: .... // // // // //

مطبع: .... فضل عمر پرنٹنگ پریس۔ محلہ احمدیہ قادیان

تعداد: .... ایک ہزار (۱۰۰۰)

سن اشاعت: .... دسمبر ۱۹۷۶ء

(باجازت نظارت دعوۃ و تبلیغ قادیان)

مندرجات

فوٹو: فوت شدہ درویش بھائیوں کے فوٹو کتاب کے آخر میں ملاحظہ فرمائیں۔ نام اور حوالہ صفحہ ساتھ دیئے گئے ہیں۔ افسوس ہے کہ بعض مرحوم درویشوں کے فوٹو تلاشِ بسیار کے باوجود نہیں مل سکے۔ یہ ایک ایسی مجبوری ہے جس کا ازالہ ممکن نہ تھا۔ فیض احمد

تقریظ

ایک دفعہ استاذی المکرّم پروفیسر جے۔ ایل۔ ہل صدر شعبہ انگریزی پٹنہ کالج (پٹنہ یونیورسٹی۔) نے میرے استفسار پر فرمایا کہ انگریزی نثر میں معیاری کتابیں چند ہی ہیں۔ اول بائیبل کا انگریزی ترجمہ، برنارڈ شا کے ڈرامے اور سوئفٹ کے نثری کارنامے۔ اہل زبان بھی ان عظیم معیاری کتابوں سے انگریزی طرز انشاء اور پختگیٔ و دلکشیٔ اسلوب سیکھتے ہیں۔ اس اظہار خیال کے بعد میری توجہ قرآن کریم کی اہمیت کی طرف پھری اور میں نے بہت غور سے اس کتاب عظیم کے اسلوب اظہار کا مطالعہ کیا۔ اور معیار و منہاج کی دولت پائی۔

قرآن حکیم کا یہ ابدی مطالبہ ہے کہ کوئی مخالف یا موافق اس جیسی ایک سورۃ بھی پیش کرے بلکہ ایک آیت ہی پیش کرے۔ اس حکمت پر غور کرنے سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے نکات بالغہ سے ہدایت و روشنی حاصل کر کے بہت سی ادبی باتیں معلوم ہو جاتی ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ طرز و اسلوب کی علیحدہ کوئی حیثیت نہیں۔ معنویت، ہیئت اور طرز کا امتزاج کامیاب اصل چیز ہے۔ حسن و بلاغت معنی اور ہم آہنگی و اسلوب کلام کو حسین، دلکش اور پرتاثیر بناتے ہیں۔ قرآن حکیم کی ایک ایک آیت میں بے مثال معنویت بھی ہے اور اس بے مثال معنویت کو لاثانی طرز اظہار کے ذریعہ بے انتہا پرتاثیر بنا دیا گیا ہے۔ قرآن مجید کا مطالبہ یہی ہے کہ کوئی ایسی روح بیان اور ایسا قالب اظہار مقابلے میں پیش کرے یہ اس کتاب مبین کا معجزہ ہے کہ آج تک اس کی کوئی مثال پیش نہ ہو سکی۔

عربی، ترکی، فارسی اور اردو ادب کے ماہروں کو چاہئے کہ وہ معنیٰ، بلاغت، فصاحت اور بیان و انشاء کی مختلف جہتوں کے لحاظ سے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کریں۔ اس ناچیز کی یہ رائے ہے کہ ادب عالم میں قرآن مجید کا بلند ترین مقام ہے۔ اور مختلف زبانوں کے ادیب حسن معنیٰ و بیان کے باب میں اس سے بہت روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ اور تجربہ و اظہار کے پیچیدہ مسائل کا حل ڈھونڈھ سکتے ہیں اس اعتبار سے قرآن کریم کے اردو ترجموں کی بڑی اہمیت ہے۔ حضرت

شاہ عبدالقادر، مولوی نذیر احمد دہلوی اور حضرت مرزا بشیر الدین محمود احمد خلیفۃ المسیح الثانیؓ کے اردو تراجم کا بھی گہرا مطالعہ کرنا چاہئے۔ " تفسیر کبیر " میں جو ترجمہ درج ہے وہ حسین اردو نثر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔

قرآن مجید میں بڑی صناعانہ خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ جمالیاتی نقطۂ نظر سے بھی اس کتاب مجید کا مطالعہ سرور و نشاط بخشنے والا ہے۔ اس میں طرز کا حسن، نادر تشبیہات و استعارات، تصویری اور محاکاتی انداز اظہار، ترشے ہوئے مکالمے، اعلیٰ کردار نگاری، پر اثر فضا آفرینی اور منظر نگاری ملتی ہے۔ ان خوبیوں کے علاوہ زور بیان استدلال کی صفائی اور توانائی، کلام کی قوت اور رعنائی، جذباتی اور تخیلی اپیل کی مثالیں ملتی ہیں۔ موضوع سخن کے مطابق ترنم نثری کی ہم آہنگی بھی ملتی ہے۔ بعض سورتیں تو نہایت مترنم ہیں۔ جیسے "سورۃ رحمٰنؔ"۔

قرآن حکیم کے اسالیب کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سادہ اسلوب کا استعمال بھی ہوا ہے اور مقفیٰ و مسجع اسلوب کا بھی۔ کہیں سادگی ہے اور کہیں پرکاری اور کہیں متوازن رنگ استعمال کیا گیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ طرز کی اپنی ذات میں کوئی خاص اہمیت نہیں ہے طرز وہ کامیاب ہے جو موضوع، موقعہ اور حال کے مطابق ہو۔ غرض یہ کہ قرآن حکیم سے بہت سے جمالیاتی اور ادبی سبق ملتے ہیں۔ ان کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔

بیان و کلام ایک بہت بڑی نعمت وقوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو بیان سکھایا ہے اور اس میں قلم کاری کی صلاحیت پیدا کی۔ مسلمانوں نے دور اولیٰ میں علم البیان اور علم الکلام میں بہت نمایاں ترقیاں کی تھیں۔ اور انہوں نے بیان وکلام کی بہت سی بالیدہ شاخیں پیدا کیں دور ثانی میں بھی ہمیں علم البیان وکلام کی طرف خاص توجہ کرنی چاہئے۔ یہ دور علم وادب کا دور ہے۔ ہمیں ایک طرف سائنس اور فلسفہ میں ترقی کرنی چاہئے اور دوسری طرف ادبیات میں۔ مجھے بڑی مسرت ہے کہ جماعت احمدیہ کے اہل قلم ادبی محاسن کے حصول کی طرف بھی توجہ کر رہے ہیں۔

جناب فیض احمد صاحب گجراتی کے مختلف مضامین کا میں نے مطالعہ کیا۔ پیش نظر مجموعہ "وہ پھول جو مرجھا گئے" بہت ہی کامیاب مجموعہ ہے۔ مقصدیت اور افادیت کے اعتبار سے بھی اور ادبیت و جمالیات کے لحاظ سے بھی۔

فیض صاحب کے ادبی میلان کا میں قائل ہوں۔ وہ بہت ہی شگفتہ سلیس اور دلکش نثر لکھتے ہیں۔ ان کے کلام میں جذباتی اور تخیلی حسن ہے۔ ادب وفن میں اخلاص کی بہت بڑی اہمیت ہے۔ آپ اخلاص و تجربہ کے مالک ہیں۔ فیض صاحب کو پیشکش کا سلیقہ بھی معلوم ہے، وہ مخلصانہ تجربات کو بڑے ادیبانہ انداز میں پیش کر سکتے ہیں۔ میں انہیں ان کی کامیابی پر مبارکباد دیتا ہوں۔ اللھم زد فزد

اختر اورینوی

پٹنہ ۴ اگست ۷۰ء

یوسف کے خریدار

دیر تک میں سوچتا رہا کہ وہ ابتدائیہ جسے مصنفین ''حرف آغاز''۔ ''پیرایہ آغاز''۔ ''تعارف''۔ ''عرض حال''۔ ''حرف اول'' اور ''تمہید'' وغیرہ کے عناوین سے تحریر کرتے ہیں اس کا نام کیا رکھوں۔ ان عنوانات میں تو کثرت استعمال کے باعث معمولی پن آچکا ہے۔ اور میں جماعت احمدیہ کے جن تاریخی اور قابل قدر درویش بھائیوں کے حالات اس مجموعہ میں شائع کر رہا ہوں ان کی عظمت کے سامنے یہ تمام عنوانات بالکل ماند نظر آئے۔

میں دیر تک سر بگریبان رہا۔ دعاؤں کے ساتھ غور کرتا رہا۔ مگر میرے اپنے غور نے میرا ساتھ نہ دیا۔ اور پھر اچانک میرے دل کی گہرائیوں سے اٹھی ہوئی ایک آواز نے میری رہنمائی کی۔

سوچتا کیا ہے؟ بے تأمل لکھ کیوں نہیں دیتا۔

''یوسف کے خریدار''

چونکہ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے اپنی عقل کو اپنے ہاتھوں ہمیشہ کے لئے موت کی گہری نیند سلا دیا اور اپنے جنون کو بروئے کار لا کر اپنی جانیں اپنی ہتھیلیوں پر رکھ لیں...... کس کے حکم سے؟ کس کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں؟ اپنے اس محبوب ترین مطاع موعود خلیفہ وقت کے اشارے پر جسے عرش اعلیٰ سے ''مصلح موعود'' جیسا عظیم الشان خطاب ملا تھا اور جس نے اپنی جماعت کی بے مایہ اور کمزور چڑیوں سے اعدائے احمدیت میں سے بڑے بڑے نامور شہبازوں کے سر کچلوا دیئے تھے اور جس کے متعلق سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے یعقوبؑ دوراں کا حلہ پہن کر فرمایا تھا کہ ؎

آ رہی ہے اب تو خوشبو میرے یوسف کی مجھے
گو کہو دیوانہ میں کرتا ہوں اس کا انتظار

یوسف کے خریدار

وہی یوسف تھا جس نے خود بھی یہ فریاد کی تھی کہ حضرت یوسفؑ بن یعقوبؑ کے بھائیوں نے تو واقعی انہیں بڑی اذیتیں دی تھیں لیکن میں نے اپنے بھائیوں (جو اپنی بدقسمتی سے خلافت حقہ کا انکار کر کے عملاً" احمدیت سے کٹ گئے تھے) سے اس سے بھی زیادہ تکلیفیں اٹھائی ہیں...... ہاں وہی یوسف تھا جس نے تقسیم ملک کے وقت احمدیت کے دائمی مرکز قادیان کے مقدس مقامات کی خدمت اور حفاظت کے لئے تین سو تیرہ کے مقدس تاریخی عدد کے مطابق جماعت سے تین سو تیرہ زندہ لاشوں کا مطالبہ فرمایا۔ یوں تو لاکھوں افراد کی جماعت کا ہر فرد اپنے محبوب امام کی آواز پر لبیک کہنے کے لئے بے قرار تھا لیکن عدد بہرحال ۳۱۳ تھا جس کا اعلان فرمایا گیا تھا...... یوں تو جماعت کا ہر ہر فرد اپنے پیارے یوسف دوراں کا عاشق صادق تھا۔ لیکن لاکھوں کی جماعت ۳۱۳ کی تحدید میں کیسے آ سکتی تھی۔ اور پھر خدائی تقدیروں کے ماتحت ۳۱۳ عشاق یوسف اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھے لبیک لبیک کہتے ہوئے آتش نمرود میں کود گئے اور عقل گزشتہ تیس سال سے لب بام کھڑی حیرت کے ساتھ محو تماشا ہے کہ آخر یہ ممکن کس طرح ہوا۔ لیکن خدائی فیصلے عقل کے پابند نہیں ہوتے...... اور پھر خرد ہمیشہ عقل کے دامن کو پیچھے کی طرف کھینچ کھینچ کر خطرات کے ہوؤں سے ڈراتی رہی۔ لیکن جنون ہمیشہ عقل و خرد کے بچھائے ہوئے داموں کو توڑتا اور پھلانگتا ہوا ان خطرات سے نبرد آزما ہی نہیں ہوتا رہا بلکہ ان پر فتح پاتا رہا۔ یہی جنون ہے جس سے تاریخ کے گیسو سنورتے ہیں۔ یہی جنون ہے جو قوموں کی شاندار تاریخوں کا سنہری باب بنتا ہے۔ اور ۳۱۳ کا عدد تو تھا ہی تاریخی اور مبارک۔ اور اسی بابرکت عدد میں شامل ہو کر اس زمانہ میں جب لاکھوں خونخوار تلواریں لہرا رہی تھیں۔ جب سارے متحدہ ہندوستان میں ہر طرف لاکھوں صلیبیں بے گناہوں کو موت سے ہمکنار کرنے کے لئے گاڑی گئی تھیں...... اسی جنون نے ۳۱۳ پھولوں کا ایک حسین و جمیل اور نظر نواز گلدستہ تیار کیا اور یہی وہ ۳۱۳ پھول تھے جو درویش کے معزز اور قابل فخر لقب سے ملقب ہوئے اور تاریخ احمدیت کا ایک سنہری باب بن گئے۔

یہ تو قرآن کریم کا بیان فرمودہ قصہ ہے کہ حضرت یوسفؑ کو آپ کے بھائیوں نے حسد و بغض کی آگ میں جل کر ایک گہرے تاریک کنویں میں پھینک دیا تھا اور کسی گزرتے ہوئے

قافلہ کے لوگوں نے جب اس کنویں سے پانی نکالا تو ان کی نظر آپ پر بھی پڑ گئی۔ اور آپ کو نکال لیا گیا لیکن عین اسی موقع پر حضرت یوسفؑ کے حاسد بھائی بھی پہنچ گئے اور نہایت حقیر رقم (دراھم معدودۃ) کے عوض قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور پھر قافلہ والوں نے اپنے زمانہ کے حسین ترین شخص اس فرستادہ الٰہی کو فروخت کر دیا۔ آپؑ کے حسن بے مثال کی شہرت سن کر مصر کے امیر ترین لوگ لعل و جواہر لے کر پہنچے۔ انہی خریداروں میں ایک بڑھیا بھی تو تھی جس کے پاس سوت کی ایک انٹی کے سوا کچھ نہ تھا۔

یہ خوش قسمت لوگ جو درویش بن کر آستانہ محبوب پر دھونی رما کر بیٹھ گئے ان کے پاس تو سوائے بے دست و پائی اور دعائے نیم شبی کے کچھ بھی نہ تھا۔ لیکن یوسف دوراں (سیدنا حضرت مصلح موعودؓ) کے عشق میں سرشار ہو کر اور رضائے الٰہی کے حصول کے لئے اپنے مستقبل، اپنے اہل و عیال اور اپنے دنیوی مفادات کو یوں قربان کر دیا کہ رہتی دنیا تک ان کا نام عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا۔ ہمیں ان سے کیا غرض جو مصر کے بازار میں گاڑیوں پر لعل و جواہر لاد کر لے گئے تھے۔ ہمارے لئے تو فخر کا یہی مقام کافی ہے کہ ؎

اپنے کیسے میں تو اک سوت کی انٹی بھی نہ تھی
نام لکھوا دیا یوسف کے خریداروں میں

یہ جو میں نے عرض کیا ہے کہ ان درویشوں کا نام رہتی دنیا تک عزت کے ساتھ یاد کیا جائے گا' یہ میں نے اپنی طرف سے عرض نہیں کیا بلکہ یہ اسی یوسف دوراں سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کا فرمایا ہوا ہے چنانچہ حضورؓ قادیان کی مقدس بستی کے ساتھ اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"اگر سلسلہ کی ضروریات مجبور نہ کرتیں تو میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ ہوتا۔ لیکن زخمی دل اور افسردہ افکار کے ساتھ آپ سے دور اور قادیان سے باہر بیٹھا ہوں۔ نہ معلوم وہ دن کب آتا ہے کہ میں بھی اس مقام پر پہنچ سکوں جو خدا کے رسول کا ...ت گاہ اور احمدیوں کا دائمی مرکز ہے۔ آپ لوگ وہ ہیں جو ہزاروں سال تک احمدی تاریخ میں خوشی اور فخر کے ساتھ یاد رکھے جائیں گے اور آپ کی اولادیں

عزت کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی۔ اور خدا کی برکات کی وارث ہوں گی کیونکہ خدا تعالیٰ کا فضل بلاوجہ کسی کو نہیں چنتا۔"

(الفرقان ربوہ درویشان قادیان نمبر صفحہ ۵)

وہ پر آشوب زمانہ جب ہندوستان اور پاکستان کے بہت سے حصوں میں شیطنت اور بہیمیت کا دور دورہ تھا اور خاص طور پر پنجاب کے دونوں حصوں میں بے حساب مقتل کھلے ہوئے تھے۔ انسانیت عنقا تھی اور اور بہیمیت ہر گلی کوچے میں ڈھول کی بلند آوازوں کے ساتھ ناچتی گاتی اچھلتی کودتی خوشیاں منا رہی تھی۔ اور ننگی تلواروں' نیزوں اور بھالوں کی چمک سے آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ قریبا" سارا مشرقی پنجاب مسلمانوں سے خالی ہو چکا تھا۔ البتہ قادیان کی مقدس بستی کے صرف مختصر سے حصے میں جہاں ہمارے مقدس مقامات واقع ہیں۔ یہ ۳۱۳ درویش اپنی بے سروسامانی' اپنی بے دست و پائی' اپنی کم مائیگی اپنی کمی تعداد کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سجدہ ریز ایسی رحمت الٰہی کے بے تابی سے منتظر تھے جو معجزہ بن جائے۔ جو رہتی دنیا تک احمدیت کا سرمایہ فخر بن جائے۔ ظاہری حالات تمام تر مخالف تھے اور جب پنجاب کے ایک کروڑ مسلمان بہ نوک شمشیر پنجاب سے یا تو نکالے جا چکے تھے یا لاکھوں کی تعداد میں قتل کئے جا چکے تھے تو کیا کوئی عقل یہ باور کر سکتی ہے کہ قادیان کے ایک چھوٹے سے قصبے میں ۳۱۳ درویشوں کے لئے کوئی مامن ہو سکتا تھا۔ لیکن جب رحمت ایزدی پشت پناہی کا ارادہ فرما لیتی ہے تو مایوسیوں کی تاریکیوں کے پردے پھاڑ کر معجزات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور ۳۱۳ درویش تاریخ کے اس شدید ترین ابتلا میں سے محض تائید و نصرت الٰہی سے سرخرو ہو کر نکلے۔ اور اللہ تعالیٰ نے انہیں مقامات مقدسہ کی خدمت کے لئے چن لیا۔

یہ واقعہ اپنی نوعیت میں اتنا نرالا' اتنا حیرت انگیز اور اتنا محیّر العقول ہے کہ جماعت احمدیہ کے لاکھوں لاکھ افراد نے تو درویشوں کی قدر کرنا ہی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی بعض حقائق پسند غیر مسلموں نے بلکہ ہمارے بعض شدید ترین معاندین نے درویشوں کی اس زندہ جاوید قربانی کو خراج تحسین پیش کیا۔ چنانچہ سردار دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر "ریاست" دہلی جو ایک نامور اور بیباک صحافی گزرے ہیں اور اپنے حقیقت افروز تبصروں کی وجہ سے ادبی دنیا میں ایک بلند مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے تحریر کیا:

۱۔ "یہ واقعہ انتہائی دلچسپ ہے کہ جب مشرقی پنجاب میں خونریزی کا بازار گرم تھا مسلمانوں کا مسلمان ہونا ہی ناقابل تلافی جرم تھا۔ مشرقی پنجاب کے کسی ضلع کے کسی مقام پر بھی کوئی مسلمان باقی نہ رہا اور یا تو پاکستان چلے گئے اور یا قتل کر دیئے گئے تو...... قادیان میں چند درویش صفت احمدی تھے...... جنہوں نے اپنے مقدس مذہبی مقامات کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ اور انہوں نے ننگ شرافت لوگوں کے ننگ انسانیت مظالم برداشت کئے۔ اور جن کو بلاخوف تردید مرد مجاہد قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور جن پر آئندہ کی تاریخ فخر کرے گی۔ کیونکہ امن اور آرام کے زمانہ میں تو ساتھ دینے والی تمام دنیا ہوا کرتی ہے۔

"ان لوگوں کو انسان نہیں فرشتہ قرار دیا جانا چاہیئے جو اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ کر اپنے شعار پر قائم رہیں اور موت کی پرواہ نہ کریں۔ اب بھی...... قادیان کے درویشوں کے اسوۂ حسنہ کا خیال آتا ہے تو عزت و احترام کے جذبات کے ساتھ گردن جھک جاتی ہے اور ہمارا ایمان ہے کہ یہ ایسی شخصیتیں ہیں جن کو آسمان سے نازل ہونے والے فرشتے قرار دینا چاہیئے۔"

(اخبار ریاست ۲ دسمبر ۱۹۵۷ء)

ہماری جماعت کے معاندین اور شدید ترین مخالفین نے ان غیر معمولی حالات میں درویشوں کے قادیان میں قیام کو شاندار الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔ صداقت اور حقائق کا وقوع خون کے پیاسوں کے ضمیر کو بھی جھنجھوڑ دیتا ہے چنانچہ جماعت احمدیہ کے وجود کو صفحہ ہستی سے نابود کر دینے کا دعوی کرنے والی جماعت "احرار" کے اخبار "آزاد" نے اپنی ۲۶ مئی ۱۹۴۸ء کی اشاعت میں "مشرقی پنجاب کے سجادہ نشین" کے عنوان سے لکھا:-

۲۔ "مشرقی پنجاب کے عوام تو خیر عوام ہی تھے۔ اگر انہوں نے پولیس اور فوج اور مسلح انسانوں کے ہجوم سے گھبرا کر مہاجرت اختیار کی تو ظاہر ہے کہ وہ مجبور تھے لیکن جس بزدلی سے مسجدوں کے اماموں۔ خانقاہوں کے مجاوروں اور ایں شریف و آں شریف سجادہ نشینوں نے فرار اختیار کیا۔ وہ اسلام کی سپرٹ اور تعلیم کے صریحاً خلاف تھا۔ تمام عمر اوقاف کی کمائی اپنے نفس پر صرف کر کے شعائر اللہ کو کافروں کے

حوالہ کر دینا اور خود بھاگ نکلنا قابل شرم فعل ہے خواجہ بختیار کا کیؒ دہلی کے سجادہ نشین صاحب جو اس مقدس تربت کی کمائی تمام عمر کھاتے رہے یوں بھاگے کہ بستی کے لوگوں سے فرمایا حضرت صاحب نے خواب میں حکم دیا ہے کہ میں پاکستان جا رہا ہوں تم بھی چلو۔ اجمیر کے متعلق حال ہی میں حیدر آباد سندھ کے متولیوں کا ایک پوسٹر آیا تھا جس میں درج تھا کہ خواجہ اجمیر کا عرس دار الکفر کی بجائے دار السلام میں منایا جا رہا ہے۔ اور تمام اہل اسلام کو دعوت شمول ہے۔ امام ناصر الدین جالندھر کا روضہ آج بے یار و مددگار پڑا ہوا ہے۔ مجدد الف ثانی کے مزار اقدس پر آج نہ کوئی چراغ جلانے والا ہے اور نہ کوئی پھول چڑھانے والا ہے۔ اور نہ ملحقہ مسجد میں اذان دینے والا ہے۔ اسی طرح ہزاروں مساجد جن میں کئی مسجدیں یادگاریں ہیں۔ سونی پڑی ہیں۔ اور ان گنت اپنی حرمت کھو کر گوردواروں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ بعض کو گھروں کی شکل دے دی گئی ہے۔ اور بہت سی اصطبلوں اور پاخانوں میں بدل دی گئی ہیں۔ کیا ان مساجد اور معابد کے ٹھیکیداروں کو علم ہے کہ ان کے اس اسلام پر خود کفر کی جبیں سے عرق ندامت کے قطرے جھلکتے ہیں؟

"ان سطروں کے لکھنے کی ضرورت اس لئے لاحق ہوئی کہ "انقلاب" کی تازہ اشاعت میں ایک قادیانی ملک صلاح الدین ایم۔ اے کا ایک مکتوب چھپا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ آج بھی مرزا غلام احمد کے مزار کی حفاظت کے لئے وہاں جانثار مرزائی موجود ہیں اور اب بھی وہاں کی مسجدوں میں اذان دی جاتی ہے۔ ایک طرف نبوت باطل کے پیروؤں کا اعتقاد دیکھئے کہ وہ اپنے "مقدس مقام" کی حفاظت کے لئے اب تک ڈٹے ہوئے ہیں۔ اور اپنی مسجدوں کی آبرو کو بچائے رکھا ہے۔ لیکن ذرا ان سے بھی پوچھئے جو درگاہ امام ناصر۔ مزار مجدد الف ثانی اور اسی طرح دوسرے سینکڑوں اہل اللہ کے مقبروں کی آمدنی ڈکارتے رہے۔ اور اب دار الکفر کی بجائے دار الاسلام میں عرس منا کر ضعیف الاعتقاد مریدوں کی جیبیں ٹٹول رہے ہیں۔ ملک صلاح الدین قادیانی کے مکتوب کی عبارت کے بعض حصص حسب

ذیل ہیں:

"ہم قریباً سوا تین سو احمدی مسلمان قادیان ضلع گورداسپور میں مقیم ہیں ابتداء میں تو ظاہری حالات کے ماتحت قریباً یقین تھا کہ ہم موت کے گھاٹ اتار دیئے جائیں گے۔ لیکن اب حالات روز بروز سدھرتے جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں قیام سے بفضلہ تعالیٰ اغوا شدہ مستورات کو بہت فائدہ ہوا ہے۔ چونکہ کشمیر کی سرحد اس ضلع سے ملتی ہے اس لئے اس ضلع کو ممنوع قرار دے دیا گیا ہے۔ اور یہاں پاکستان کی ملٹری یا پولیس مستورات کو نکالنے کے لئے نہیں آ سکتی۔"

"گذشتہ اکتوبر سے اس وقت تک ہمارے قریب کے دیہات سے......صرف چار پانچ عورتیں برآمد کی ہیں۔ لیکن چونکہ خدا کے فضل سے اس وقت بھی قادیان میں چار جگہ سے اذان بلند ہوتی ہے۔ اس لئے جب متعدد مسلمان عورتوں کو اذان سنکر معلوم ہوا کہ ہم یہیں ہیں۔ تو وہ موقع پا کر ہمارے پاس پہنچ گئیں۔ بعض کو عیسائی ہمارے پاس پہنچا گئے۔ بعض کو خود بعض شریف مزاج سکھ پہنچا گئے بعض چونکہ دیہات پر حملہ ہونے کے وقت قادیان آ کر ٹھہری تھیں اس لئے انہیں علم تھا کہ یہ بھی مسلمانوں کا مرکز ہے۔ یا انہوں نے غیر مسلموں سے قادیان کا ذکر سنا تھا تو چھپ چھپا کر موقع پا کر بھاگ آئیں۔ خوف کی وجہ سے مذہب تبدیل کرنے والے مسلمان قریباً اسی کی تعداد میں ہمارے پاس آئے اور ہم نے ان کی رہائش اور خوراک کا انتظام کیا۔ اور جب ہمارے ٹرک قادیان آتے تھے تو ہم انہیں بحفاظت پاکستان پہنچا دیتے تھے اور اب سپیشل پولیس کے ذریعے انہیں پاکستان بھجوا دیا جاتا ہے۔ اور ان کے اقارب کو خطوط، تار اور فون کے ذریعے اطلاع دی جاتی ہے۔ گرد و نواح اور قادیان کے علاوہ ان عورتوں میں کئی ہوشیار پور، امرتسر، فیروز پور، سیالکوٹ کے اضلاع اور ریاست جموں کی تھیں۔'

"کیا اس خط کے بعد مشرقی پنجاب کے سجادہ نشین اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ ان کے دل میں بھی اسلام ہے۔"

اس مسلمان سے سوبار ہے کافر اچھا
جس مسلمان کے پیش نظر انجام نہ ہو"

۳۔مسٹر ایچ۔آر۔دوہرا جو ایک شریف النفس غیر مسلم ہیں، نے دہلی کے مشہور انگریزی اخبار سٹیٹسمین کی ۱۷، ۱۸ نومبر ۱۹۴۸ء کے اشاعت میں تحریر کیا:۔

"قادیان حضرت مرزا غلام احمد (علیہ السلام) کی جائے پیدائش ہے جنہوں نے ۱۸۹۱ء میں مسیح موعود ہونے کا دعویٰ کیا۔آپ نے اس بات کا اظہار کیا کہ آپ حضرت مسیح علیہ السلام کی صفات اور خو بو لے کر آئے ہیں۔قادیان لاکھوں مسلمانوں کا جو احمدیہ جماعت سے تعلق رکھتے ہیں، مقدس مقام ہے۔اس کی چپہ چپہ زمین احمدیوں کو محبوب ہے یہ قصبہ احمدیہ جماعت کا مرکز رہا ہے۔اور اس میں مسیح (موعود علیہ السلام) کے خلفاء کی رہائش رہی ہے۔

"قادیان میں مقیم ۳۱۳ مومنین باوجود سرکاری افسران کی ابتدائی مخالفت اور غیر مسلم پناہ گزینوں کی عداوت کے قادیان میں قائم رہے.اس کی وجہ اپنی جماعت کے اصولوں میں ان کا غیر متزلزل ایمان، حکومت وقت کے ساتھ وفاداری اور تمام مذاہب کے ساتھ ان کی رواداری کی تعلیم ہے۔"

"احمدیہ جماعت کے افراد کا یہ عقیدہ ہے کہ جملہ مذاہب سے یکساں سلوک کیا جائے۔اسی اصول کی بناء پر وہ قادیان کے ہندو سکھ یتیموں کی مدد کرتے رہے ہیں۔اور اب بھی جبکہ جماعت کی مالی حالت بہت کمزور ہو چکی ہے ان یتیموں کی ایک تعداد اپنے وظائف حسب معمول احمدیہ جماعت سے حاصل کر رہی ہے۔"

۴۔اخبار "تنظیم" پشاور نے اپنی ۳۰ جولائی ۱۹۵۰ء کی اشاعت میں بڑی ہی جرأت کے ساتھ درویشوں کے اس عزم بلند کا اعتراف ان شاندار الفاظ میں کیا:۔

"رسولؐ کے تین سو تیرہ ساتھیوں نے مکے والوں کو شکست دی اور بعد میں مکہ بھی فتح کیا۔آج آپ ہی کے نقش قدم پر مرزا غلام احمد قادیانی ولد مرزا غلام مرتضیٰ قوم مغل سکنہ قادیان تحصیل بٹالہ ضلع گورداسپور کے تین سو تیرہ مرید قادیان میں ڈٹے ہوئے

ہیں۔اور ان کا یہ حتمی فیصلہ ہے کہ وہ رسول اکرم کے صحابہ کرام کے نقش قدم پر چل کر قادیان کی مسجد مبارک۔جامعہ احمدیہ اور بہشتی مقبرہ جہاں حضرت مرزا صاحب دفن ہیں کی حفاظت کے لئے تن من دھن سے مصروف یاد خدا و امداد خدا ہیں۔ان میں بہت سے عالم حافظ اور صوفی ہیں۔"

۵۔اخبار "المنبر" لائل پور کے ایڈیٹر جناب مولوی محمد اشرف صاحب نے جو جماعت احمدیہ کے مخالفین میں سے اولین فہرست میں شمار ہونا پسند فرماتے ہیں اپنی ۲ مارچ ۱۹۵۶ء کی اشاعت میں تحریر کیا کہ:

"یہ وہ واحد جماعت ہے جس کے ۳۱۳ افراد تقسیم کے لمحہ سے آج تک قادیان میں موجود ہیں اور وہاں اپنے مشن کے لئے کوشاں بھی ہیں۔اور منظم بھی۔"

۶۔رسالہ "چٹان" لاہور (جس کے ایڈیٹر جناب شورش کاشمیری جماعت احمدیہ کے سب سے بڑے دشمنوں میں بلکہ ان کا سرخیل کہلانا پسند کرتے تھے) نے ۱۹۶۱ء میں (جلد ۱۱ شمارہ ۱۴ ص ۶) تحریر کیا:۔

"ہم عاجز ہیں اور ہمیشہ ہی اپنے عجز کا اقرار کیا ہے لیکن اتنے ہیٹے بھی نہیں کہ جماعت اسلامی کے ارکان کو اولیاء اللہ کی صفت میں جگہ دیں۔اور خود مرید با صفا بنے رہیں۔آدمی تو ہر شخص اکٹھا کر لیتا ہے۔مرزا غلام احمد نے بھی اکٹھے کر لئے تھے۔فضلاء کی ایک بہت بڑی جماعت اس کی جانثار ہے۔پھر یہ واقعہ نہیں؟ کہ "دارالسلام" کے چابی برداروں میں اکثر برقعے پہن کر بھاگ نکلے تھے۔مگر مرزا غلام احمد کے پیرو آج تک قادیان کی حفاظت تین سو تیرہ کی جتھہ بندی سے کر رہے ہیں۔"

☆ ☆

جماعت کے اولوالعزم امام سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ، نے قادیان کے درویشوں کے عزم و حوصلہ کو بلند کرنے اور جماعت کی عزت و وقار کو بلند رکھنے کے لئے اپنے ایک مکتوب گرامی ۱۰ اکتوبر ۱۹۴۷ء میں یہ تاریخی اور شاندار الفاظ تحریر فرما کر انہیں مشکلات کے طوفانوں کے سامنے سینہ سپر ہو جانے کی یوں نصیحت فرمائی:

"بہر حال استقلال سے جمے رہو۔ جب تم لوگ خدا کی راہ میں شہید ہونے کے لئے بیٹھے ہو تو پھر خوف کو دل میں آنے دینے کے معنے ہی کیا ہوئے جو شخص خدا تعالیٰ کے راستہ میں قربان ہونے کے لئے بیٹھا ہوا سے پھر کسی قسم کے انجام کا ڈر نہیں ہوتا کیونکہ موت کے بعد اور کونسا خطرہ رہ جاتا ہے۔ مجھے تو صرف عورتوں کی فکر ہے۔ خدا کرے عورتوں کی عزت محفوظ رہے......

"مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اپنے حوصلے کو بلند رکھو اگر دین کی اشاعت کا خیال نہ ہوتا تو میں تم لوگوں کو باہر بھجوا دیتا اور آپ تم لوگوں کی جگہ وہاں کام کرتا۔ کربلا کا واقعہ یاد رکھو۔ اور سب دوستوں کو یاد کراؤ کس طرح رسول کریم ﷺ کے سب خاندان نے بھوکے پیاسے رہ کر ثابت قدمی سے آخر دم تک لڑائی کی اور سب نے جان دے دی ۔تمہارا خطرہ ان کے برابر نہیں۔

"آخر یہ سلسلہ خدا تعالیٰ کا ہے اور وہ ضرور اپنی قدرت دکھائیگا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا الہام ہے یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھر کم تطھیرا شاید یہ وہی ابتلاء ہے۔ اللہ تعالیٰ اس ابتلاء میں ڈال کر ہمارے خاندان کے گناہوں کو جو بہت بڑے ہیں معاف کر دے گا یا شہادت دے کر ان کو دھو دے گا۔ اور آئندہ سلسلہ کی زندگی کا اسے ایک ذریعہ بنا دے گا......

"اس وقت ساری دنیا کی نظریں تم لوگوں پر ہیں۔ ہر دشمن تک حیرت سے تم لوگوں کے استقلال اور قربانی کو دیکھ رہا ہے۔ اور تمہاری یہ قربانی سلسلہ کی عزت کو چار چاند لگا رہی ہے۔ یہ خدا تعالیٰ کا کم فضل نہیں کہ تم لوگوں کو یہ ثواب مل رہا ہے۔

"میری کمر سلسلہ کے غم میں خمیدہ ہو رہی ہے۔ اور صحت کمزور ہو رہی ہے مگر اللہ تعالیٰ سے امید ہے کہ اس غم کو آخر اسلام کی کامیابی کا موجب بنا دے گا۔ اگر ایسا ہو تو ہماری زندگیاں ٹھکانے لگیں گی۔ اور ہماری قربانیاں، قربانیاں نہیں بلکہ انعام بن جائیں گی۔ میرے بچو! جسمانی اور روحانی بچو! اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ناامید نہ ہو۔ اور اپنے حوصلے پست نہ ہونے دو کہ موت بہر حال آئے گی۔ چاہیئے کہ جتنا خطرہ بڑھے تمہارے

حوصلے بھی بڑھتے جائیں۔ اور تمہارے دل میں خوشی کی لہر دوڑتی جائے کہ اس عظیم الشان قربانی کے لئے جو اسمٰعیلؑ کی قربانی کے مشابہ ہے۔ خدا تعالیٰ نے تم کو چنا اے قادیان کے ساکنو! آج آسمان کے فرشتے تمہارے استقلال پر خدا تعالیٰ کی حمد گا رہے ہیں آج اللہ تعالیٰ بھی تمہارے کام دیکھ کر خوش ہے کہ میرا مسیح کامیاب آیا اور اس نے ایسی جماعت بنا دی جو خدا تعالےٰ کی راہ میں فاقہ اور پیاس اور موت کو فخر سمجھتی ہے۔ اور دُنیا کی محبت اس کے دل سے سرد ہے۔ آج ہمارا مسیح بھی یقیناً خوش ہوگا وہ آپ لوگوں کے لئے دعا بھی کرتا ہوگا۔ اور خدا تعالیٰ کی حمد کے ترانے بھی گاتا ہوگا کہ اس نے اس سچائی کا زندہ ثبوت بہم پہنچا دیا۔ اور دنیا کو بتا دیا کہ اس مسیح نے پہلے مسیح سے زیادہ شاندار مردے زندہ کئے ہیں۔ تم لوگ زندہ رہے تو اسلام کی زندگی کا ایک نشان ہوگے. اور شہید ہوئے تو اسلام کی قوت قدسیہ کا ایک ثبوت ہوگے. خدا تعالیٰ تمہارا حافظ و ناصر ہو۔ اور تم کو احمدیت کی آئندہ ترقی کے لئے کام کرنے کی توفیق دے. مگر اس کے ساتھ ہر تکلیف اور ہر انجام کے لئے بھی تم کو تیار رہنا چاہیے کیونکہ جو موت سے گھبراتا ہے اس کی زندگی بھی بے کار ہوتی ہے......

"خدا کرے ہمارا قادیان سلامت رہے۔ اور ہم اس کی جگہوں میں خدا کی حمد گاتے پھریں گیا۔ خدا تعالیٰ تمہارے ساتھ ہو۔

والسلام خدا کا عاجز بندہ اور اس کے دین کا خادم۔

تمہارا دُعا گو

مرزا محمود احمد"

ہم درویشوں میں سے یہ دعویٰ تو کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے درویشی کی یہ عظیم الشان سعادت اور احمدیت کے دائمی مرکز قادیان کی خدمت کے مواقع اس کی کسی ذاتی نیکی اور قابلیت کی وجہ سے عطا فرمائے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم میں سے اکثر اپنے اوصاف و کردار اور بشری کمزوریوں اور تعلیمی حیثیتوں کے اعتبار سے بہت ہی نااہل تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو ایسی سعادت بخشنا چاہتا ہے تو اس کی ذرہ نوازیاں بروئے کار آتی ہیں۔ اور پھر یوں ہوتا ہے کہ بیری کے

درخت کا بے ڈول ٹیڑھا میڑھا ڈنڈا حضرت موسیٰ کے ہاتھ میں جب آتا ہے تو فرعونوں کے تمام جادوگر شکست انجام ہوتے ہیں۔ اور وہ ڈنڈا اُن جادوگروں کے اژدھوں کو نگل جاتا ہے۔ اور تاریخ نویس انگشت بدنداں رہ جاتے ہیں کہ یہ آخر کس طرح ممکن ہوا!!؟

کیا یہ ایک تاریخی حقیقت نہیں کہ بدر کی تاریخی جنگ میں جو تقویت وشوکت اسلام کی بنیاد بن گئی ۳۱۳ کمزور نہتے مسلمانوں نے دشمن عرب قبائل کے نامور صنادید کو پیوند خاک کر دیا کیا اس تاریخی واقعہ سے انکار کی گنجائش ہے کہ نمرود نے حضرت ابراہیم کو صفحہ ہستی سے نابود کر دینے کے لئے جو وسیع وعریض آتش سوزاں بھڑکائی تھی اسے ابوالانبیاء کے بابرکت وجود نے گلزار میں بدل دیا یہ حقیقت ابتدائے آفرینش سے معرض وجود میں آرہی ہے اور آتی چلی جائیگی آسمان کی بلندیوں پر یانارکونی برداوسلاما علیٰ ابراہیم کے بے شمار احکامات اذن الٰہی کے منتظر رہتے ہیں اور جہاں کہیں الٰہی جماعتوں کو وقت کے نمرود بھڑکتے اور آسمان سے باتیں کرتے شعلوں میں پھینکنا چاہتے ہیں اذان الٰہی صادر ہوتا ہے آج تک دنیا کے ہر نبی اور اوتار کی توحید پرست جماعتوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کا یہی سلوک رہا لیکن اس کے باوجود ہر دور کے فرعون اور ہر زمانہ کے نمرود اپنی ظاہری قوتوں اور سطوتوں کے بل بوتے پر خدا کے مقابلہ پر کھڑے ہوتے ہیں اور انجام کار نہ صرف ان کی ہستیاں مٹ جاتی ہیں بلکہ ان کے نام تاریخوں میں علیہ العنۃ ساتھ لکھے جاتے ہیں۔

میں ذکر تو یہ کر رہا تھا کہ درویشی کی یہ تاریخی سعادت ہماری کسی ذاتی نیکی یا خوبی کے نتیجہ میں ہمیں نہیں ملی تھی بلکہ خدا تعالیٰ کی رحمت نے ناچیز تریں ذروں کو اپنے قرب کے مواقع بخشے تھے۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ

اگلے صفحات میں آپ ان خوش قسمت درویشوں کے مختصر حالات ملاحظہ فرمائیں گے جو سلسلہ کی قابل قدر خدمات بجالاتے ہوئے نہایت سرخروئی کے ساتھ منھم من قضیٰ نحبہ کی فہرست میں داخل ہو کر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں کے مورد بنے اور زیر خاک ابدی آسودگی کی زندگی گزار رہے ہیں میں ان تمام قابل صداحترام درویش بھائیوں کی روحوں کو مبارکباد دیتا ہوں اور ان کے تمام پسماندگان کو بھی ہدیہ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ان کی قربانیوں کو شرف قبول بخشا گیا۔

میں نے درویش بھائیوں کے حالات لکھتے وقت سوانح نگاری نہیں کی میں نے تو ان کی خدمت

میں عقیدت کے پھول پیش کئے ہیں وہ زمانہ قریب ہے جب ان درویشوں کے سوانح لکھنے والے بھی پیدا ہوں گے جو مختصر حالات میں نے تحریر کئے ہیں ان میں بے شک تشنگی ہے مجھے یہ بھی تسلیم ہے کہ اپنی کمی علم کے باعث ان کی خدمت میں عقیدت کے پھول الفاظ کی صورت میں اس رنگ میں پیش نہیں کر سکا جو ان کا واقعی حق تھا۔

میں نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی ہے کہ ان تمام وفات یافتہ درویش بھائیوں کے فوٹو زمل جائیں لیکن افسوس کہ بعض کے فوٹو حاصل کرنے میں مجھے کامیابی نہ ہوئی ممکن ہے آئندہ کسی وقت دوسرے ایڈیشن میں یہ کمی پوری ہو جائے۔

''وہ پھول۔۔۔جو مرجھا گئے'' کتاب کا یہ نام میرے محترم بزرگ بھائی جناب ڈاکٹر سید اختر احمد صاحب اورینوی ریٹائرڈ صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی کا تجویز فرمودہ ہے ورنہ میں نے ابتداء میں درویشوں کے جو حالات بدر میں شائع کروائے تھے وہ گلدستہ جس کے چند پھول مرجھا گئے۔ کے عنوان سے لکھے گئے تھے لیکن بعد میں جناب اختر بھائی کی تجویز پر عنوان بدل دیا گیا تھا۔

میں اپنے اس قابل صد احترام محسن کا یہ حق سمجھتا ہوں کہ ان کے لئے قارئین کی خدمت میں دعا کی درخواست کروں وہ کئی سالوں سے بیمار چلے آرہے ہیں اور ساری جماعت کی دلی اور پرسوز دعاؤں کے مستحق ہیں ان کا حق اس لئے ہم سے بھی فائق ہے کہ وہ یوسف دوراں سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے ایک بہت بڑے عاشق ہیں انہوں نے بیماری سے قبل ایک بہت ہی قابل قدر کتاب لکھنا شروع کی تھی جس کا پہلا حصہ مکمل بھی ہو چکا تھا لیکن ان کی بیماری نے اس کتاب کی تکمیل میں روک ڈال دی اگر یہ کتاب مکمل ہو جاتی اور خدا کرے اب بھی ہو جائے تو سلسلہ کی تاریخ میں ایک نہایت قیمتی لٹریچر کا اضافہ ہوگا یہ کتاب سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے سوانح پر مشتمل ہے اللہ تعالیٰ ہم سب کی دعاؤں کو قبولیت کا شرف عطا فرما کر اور ان کی اہلیہ محترمہ شکیلہ اختر صاحبہ کی دعاؤں التجاؤں اور خدمات عظیمہ کو قبول فرما کر صحت کاملہ عاجلہ بخشے آمین۔

ناچیز راقم دعاؤں کا طالب
خاکسار: چودھری فیض احمد گجراتی درویش
ناظر بیت المال آمد۔ قادیان ۱۴ اکتوبر ۱۹۷۶ء

مِنھُم مَنْ قَضٰی نَحْبَہٗ

وہ جو بیچتے تھے دوائے دِل وہ دکان اپنی بڑھا گئے![۱]

۱حاشیہ:- دکان بڑھانا محاورہ ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ دکان بند کر دینا۔

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانیؓ

یکے از ۳۱۳ صحابہ کرامؓ

وقت کی تیز آندھیاں جب عمر کے سر پر سے متواتر گزرتی دنوں کو ہفتوں مہینوں اور سالوں میں تبدیلی کرتی چلی جاتی ہیں اور ہم اپنی زندگی کی مصروفیات اور معیشت کی تگ و دو میں اپنی عمر رواں کے دوش پر آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں' تو ہمارا ماضی اپنی تلخیوں اور مسرتوں سمیت ہماری نظروں سے روپوش ہوتا ہوا ہماری یادوں کی گرفت سے بھی نکلتا چلا جاتا ہے اور ایک وقت آتا ہے کہ ہمارا رہوار تخیل بھی ان گریز پا لمحات تک نہیں پہنچ پاتا۔

پھر نسیان کا مرض بھی ہمارے لئے رحمت کا موجب بن جاتا ہے۔ اور ہم اپنے ماضی کی تلخیوں کو اپنی لوح دماغ سے کھرچ کر مٹا دینے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ اور اگر نسیان کا مرض نہ ہوتا تو آج دنیا کی آبادی کا ایک بڑا حصہ پاگل پن کا شکار ہوتا۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جو لوگ حادثات کو بھول نہیں سکتے وہ اپنے حواس کھو بیٹھتے ہیں۔

کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم درویش اپنے اعزہ واقربا سے جدا رہ کر اپنے جذبات محبت اور حسیات الفت سے عاری ہو چکے ہیں۔ نہیں' بلکہ ہم نے ایک الگ دنیا بسائی ہوئی ہے۔ اور ہماری درویش برادری ہی ہمارے لئے سب کچھ ہے۔ اس چھوٹی سی دنیا میں ہمیں یہ ساری نعمتیں میسر ہیں۔ ہم ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کی خوشیوں میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ ہمیں ایک ایسی برادری میسر ہے جس کی مثال دنیا میں بہت کم ملے گی۔ بلکہ نسلی' عرفی' اور کفوی برادری اس کے مقابلہ میں کوئی چیز ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ہماری برادری کے کسی رکن کو کوئی صدمہ یا حادثہ پیش آتا ہے تو ہم سب اسے یکساں محسوس کرتے ہیں۔

تاہم وقت سب سے بڑا مرہم ہے اور آہستہ آہستہ زخموں کو مندمل کر دیتا ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو زندگی کربناک ہو جاتی۔ اگر نسیان ہمیں لاحق نہ ہوتا تو ہماری یادیں ایک مستقل درد بن جاتیں۔ اور اگر ماضی ہماری چشم تصور کی گرفت سے آزاد نہ ہوتا تو ہمارے حواس ہمہ اوقات متاثر رہتے۔

اسی قسم کے بعض حادثات ہماری درویش برادری کو بھی پیش آتے رہے کہ ہمارے اعضاء وجوارح کا حکم رکھنے والے ہمارے بھائی کارکنان قضاوقدر نے ہم سے چھین لئے۔ اور دل حزن وملال سے بھر گئے۔ اور آنسوؤں کی جھڑیاں لگ گئیں۔

اور اگر وقت زخموں کے لئے مرہم نہ بنتا تو آج بھی ہمارے وہ زخم سرسبز ہوتے جو ہمارے دلوں پر ہمارے محترم بزرگ حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی کی اچانک وفات نے گزشتہ سال لگائے تھے اور ہماری درویش برادری نے محسوس کیا تھا کہ اس عمارت کا ایک ستون گر گیا ہے۔ جس میں ہم چودہ سال سے مکین تھے کوئی دل نہ تھا جو رہین غم نہ تھا اور کوئی آنکھ نہ تھی جو پرنم نہ تھی۔

حضرت بھائی جیؓ اس گلدستہ کا ایک پھول ہی نہ تھے بلکہ بجائے خود ایک گلدستہ تھے۔ بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ایک گلستان تھے۔ ایسا گلستان جو خزاں نا آشنا ہو جو سدا بہار ہو اور جس میں ہزاروں پھول چن کر سینکڑوں گلدستے تیار کئے جا سکتے ہوں۔ ایسے گلدستے جو اپنے رنگ وبو سے مشام جاں کو معطر کرتے ہوں۔

میں کوئی سوانح نگاری نہیں کر رہا اور نہ ہی میرا موضوع سیرت ہے۔ بلکہ یہ تو درویش برادری کے ان محترم اراکین کی یاد میں چند آنسو حوالہ قرطاس کر رہا ہے۔ جو اب ہم میں موجود نہیں ہیں۔ اور جن کے ہیولے حافظے کے پردے پر کبھی کبھی اچانک آ کر یادوں میں ایک المناک ارتعاش پیدا کر جاتے ہیں۔ اور ہم منھم من قضی نحبہ کی خوش بختی پر رشک کرنے لگتے ہیں اور منھم من ینتظر کی کشمکش کے بسلامت کنارے پر لگنے کے لئے دعائیں کرتے ہیں۔

حضرت بھائی جیؓ اپنی ذات میں ایک شگفتہ چمن تھے۔ اور زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ایک مقدس یادگار تھے مامور زمانہ کا صحابی ہونا ایک بہت بڑا اشرف ہے جو روحانی دنیا میں ہمیشہ عزت اور احترام کی نظروں سے دیکھا گیا اور دیکھا جاتا رہے گا لیکن آپؓ کو ایک اور بہت بڑا شرف حاصل تھا کہ آپؓ نے ایک لمبا عرصہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدموں میں رہ کر گزارا۔ اور سفر وحضر میں حضورؑ کی معیت میں رہ کر بیشمار برکتیں حاصل

کیں اور اس بابرکت صحبت کے مصقل سے اپنی روحانیت کو اس طرح صیقل کیا کہ آخری دم تک اس کی چمک دمک نہ صرف قائم رہی بلکہ ہم جیسے کمزوروں کے لئے مشعل راہ رہی۔

اپنا اپنا ذوق ہوتا ہے اور اپنی اپنی نظر مجھے حضرت بھائی جی کی زندگی کے مطلب میں جو چیز سب سے زیادہ عجیب نظر آئی اور جس چیز نے مجھے ایک روحانی اہتزاز بخشا۔ وہ یہ۔ ہے کہ آپؓ جس وقت پہلی بار قادیان تشریف لائے آپ کی عمر پندرہ سولہ سال کی تھی یہ وہ عمر ہوتی ہے جب انسان طبعاً گرمجوش ہوتا ہے۔ جوانی کی امنگیں اپنے شباب پر ہوتی ہیں اور مستقبل کے لئے خواہشات و عزائم کا ایک لامتناہی سلسلہ خیالات وجذبات کے سمندر میں موجزن ہوتا ہے اور انسان گویا خیالی پر لگا کر فضاؤں میں پرواز کرتا ہے یہ وہ عمر ہوتی ہے کہ توسن شباب بے لگام ہوتا ہے، اور مختلف قسم کی بیشمار لغزشیں اس کی مخمور آنکھوں کے سامنے ہم رنگ زمین دام بچھاتی ہیں۔ پھر اگر کوئی نوجوان ایسا ہو جس نے اسلامی ماحول میں پرورش پائی ہو اور اس کے تمام متعلقین مذہب کے سختی سے پابند ہوں اور وہ نیکی کی طرف مائل ہو جائے تو جائے تعجب نہیں۔ لیکن یہاں معاملہ بڑا ہی عجیب و غریب ہے ایک ایسا نوجوان جس کا کنبہ غیر مسلم ہے۔ اسلام کی شمع سینے میں روشن کئے گھر سے نکلتا ہے مہر پدری کی سلاسل کو توڑ کر مامتائے مادری کی مقناطیسی کشش سے دامن بچا کر اپنے بھائیوں اور بہنوں کی محبت کو قربان گاہ عشق حقیقی پر قربان کر کے اپنوں اور بیگانوں کی نظروں سے بچتا ہوا اور سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا ہوا رواں دواں ہے کہ وہ سینا برنگ قادیان اس کی منزل گاہ ہے اور وہ افتاں وخیزاں وہاں پہنچتا ہے جہاں دور سے لمعات نور آسمانی کی لرزاں جھلک اس کی فکر ونظر کو خیرہ کر رہی تھی۔

میں بھٹکتی ہوئی شباب کی ڈیوڑھی میں قدم رکھتی ہوئی لیکن شباب کی مادی امنگوں سے یکسر تہی ایک سعید روح اپنے تمام دنیوی رشتوں سے منہ موڑ کر آستانہ الوہیت پر جبہ سائی کے لئے قادیان پہنچتی ہے اور بس یہیں کی ہو جاتی ہے اور پھر اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو جذب کر کے اس مقام ارفع پر جا پہنچتی ہے۔ جو قابل رشک بھی ہے اور ایمان افروز بھی۔ اور یوں مہتہ ہریشچند راپنی فطری سعادت سے فضل خداوندی کو جذب کر کے حضرت بھائی عبدالرحمٰن قادیانی بنتا ہے۔ اور مامور زمانہ کا جلیل القدر صحابی ہونے کا شرف حاصل کرتا ہے۔

اوراس انعام الٰہی کا بڑے عجز وانکسار کے ساتھ یوں اعتراف کرتا ہے:

''مجھے بچپنے ہی میں اللہ کریم نے کفر سے نکال کر دولت ایمان عطا فرمائی اور میری خوش بختی کو اپنے فضل سے یوں چار چاند لگا دیئے کہ سیدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کے قدموں میں لا ڈالا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو میں نے حضور پر نور ہی کی صحبت میں سیکھا۔ اور یہ اللہ کریم کا فضل تھا کہ اس طرح مجھے اسمی اور رسمی اسلام کی بجائے حقیقی اور صحیح اسلام کی نعمت میسر آئی۔''[۲]

ایسی سعید روح ہو اور دل کی گہرائیوں میں آستانہ الوہیت پر سجدہ ریز ہونے کی تڑپ لے کر مامور زمانہ کے قدموں میں پہنچی ہو۔ تو اس کے عبد حقیقی ہونے میں کیا کلام ہے۔ چنانچہ اس کے اسلام قبول کر لینے کے بعد حضرت مسیح علیہ السلام نے ایک لفظ میں اس کی تصویر کھینچ دی۔ یعنی

''عبدالرحمٰن''

اور اس طرح رحمٰن کا یہ عبد مسیحائے زمان کے دروازے پر خادم بن کر بیٹھ گیا۔ اور اس خدمت کا صلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسے یہ ملا کہ وہ خود مخدوم بن گیا۔ وہ جس راہ سے گزرتا تھا عقیدت مند آنکھیں بچھاتے تھے آپؓ اپنے نام کے متعلق فرماتے ہیں:۔

''عبدالرحمٰن میرا اسلامی نام سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کی زبان مبارک سے رکھا ہوا نام ہے جو حضور پرنور نے مسجد مبارک کے وسطی حصہ میں بیٹھے ہوئے ۱۳۱۱۔۱۳۱۲ ہجری المقدس کو تجویز فرمایا تھا جبکہ اللہ کریم نے مجھے حضور کے دست مبارک پر خلعت اسلام اور سعادت بیعت سے نوازا اور سرفراز فرمایا تھا۔''

اللہ تعالیٰ ہمیشہ جوہر قابل کو نوازتا ہے اور خاک نشینوں کو ساکنانِ عرش کی ہم نشینی بخشتا ہے۔ چنانچہ حضرت بھائی جیؓ کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر نوازا کہ آپؓ کا نام ۳۱۳ صحابہ کرام کی فہرست میں ہے اور ضمیمہ انجام آتھم میں سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام نے آپؓ کا نام درج فرمایا ہے۔ آپ خود تحریر فرماتے ہیں:

''ضمیمہ انجام آتھم میں حضور پرنور نے جو فہرست ۳۱۳ خدام کی شائع فرمائی اس کے ۱۰۱ نمبر پر مجھ ناکارہ کا نام درج ہے۔''[۳]

حضرت بھائی جیؓ کو یہ شرف اور امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپؓ تیرہ سال کا لمبا عرصہ سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدموں میں اور حضورؑ کے سفر و حضر میں ساتھ رہے۔ چنانچہ حضورؑ کے آخری سفر لاہور میں بھی ساتھ تھے۔ اور حضورؑ کے وصال پر غسل اور کفن و دفن میں بھی حصہ لیا اور اس کے بعد اپنی ساری عمر خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خدمت میں گزاری۔

حضرت بھائی جیؓ کی ذات گرامی میں ایک بڑی پیاری، بڑی قابل رشک اور بڑی قابل تقلید بات یہ بھی نظر آتی ہے کہ آپ کو خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے تمام مقدس افراد کے ساتھ بلا لحاظ عمر بےحد محبت اور عقیدت تھی۔ یوں تو تقسیم مُلک سے قبل بھی ہمیں اس چیز کا علم تھا لیکن زمانہ درویشی میں جب ہم نے بہت ہی قریب سے یہ نظارے دیکھے تو حقیقت یہ ہے کہ خاندان مقدس کے افراد سے محبت کرنا ہمیں بھی آ گیا عجیب نظارہ ہوتا تھا وہ جب حضرت بھائی جیؓ کو حضرت مرزا وسیم احمد سلّمہٗ اللہ تعالیٰ کا سامنا ہو جاتا۔ پس دیکھتے ہی چہرے پر ایک سنجیدگی ایک احترام، ایک عقیدت نمایاں ہو جاتی اور مجسم عجز وانکسار بن کر کھڑے ہو جاتے اور جھک کر دست بوسی کرتے اور جب سر اُٹھاتے تو آنکھوں میں نمی کی ایک چمک ہوتی۔ غالباً ان کی نمناک نگاہیں قابل احترام پوتے کے چہرے میں اس کے مقدس دادا* کا تصور لئے ہوتی تھیں۔

مسیحائے زماں کے در کی دربانی کا ذکر جب وہ بڑی رقت کے ساتھ گلوگیر آواز میں کرتے تو آنسو پپوٹوں کی چلمنوں میں سے جھانکتے رہتے۔ اور سننے والے اور سمجھنے والے سمجھ جاتے کہ آپ کا جسم تو اس وقت ہماری مجلس میں ہے۔ لیکن روح ماضی کی طرف پرواز کناں ہے۔ اور مسیحائے زماں کی مجلس وصحبت کو تلاش کر رہی ہے۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے آپ اپنی اسی چٹھی بنام سیکرٹری بہشتی مقبرہ قادیان میں تحریر فرماتے ہیں کہ (پہلی بار قادیان آنے سے قبل)

''اُن دنوں میں اس خیال میں تھا کہ قادیان جا کر اظہار اسلام کروں گا۔ اور اُن فقیر و بزرگ (حضرت مسیح موعود علیہ السلام۔ ناقل) کے سامنے نذر و نیاز پیش کر کے واپس چلا آؤں گا۔ مگر جب اللہ کریم نے اس نورانی چہرہ اور صاحب نور نبوت ورسالت کے قدموں میں لا ڈالا۔ صبح کی سیر۔ شام کا دربار اور ظہر وعصر کی مجلس وصحبت میسر آئی تو وہ پہلا خیال دل سے ڈھل گیا اور میں دنیا جہان سے بے نیاز ہو کر

اسی در کا ہو گیا۔ دھونی رما کر بیٹھا۔ اور خدا نے ایسا فضل فرمایا کہ اس در کی گدائی دنیا جہان کی دولت وثروت سے ہزار گنا بہتر نظر آئی۔ اور خدا کا فضل ہوا کہ آخر میں اسی در کا ہو گیا۔ یہیں پرورش پائی۔ اور اسی دروازہ سے اسلام سیکھا۔ اور دولت ایمان پائی۔ فالحمدللہ۔"

بہر حال حضرت بھائی جیؓ نے اپنی عمر عزیز کے پینسٹھ سال حقیقتاً اسی در کی دربانی میں گزار دیئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بھی آپ کو نوازا اور دین و دنیا میں سرفراز کر دیا۔ اولاد بھی دی اور جائداد بھی۔ اور پھر ایک سعادت یہ بھی بخشی کہ زمانہ درویشی میں بھی قادیان میں رہ کر خدمات سلسلہ بجالانے کی توفیق آپ کو ملی۔ آپ صدر انجمن احمدیہ۔ صدر انجمن تحریک جدید اور مجلس کار پرداز مصالح قبرستان بہشتی مقبرہ کے ممبر کے حیثیت سے اپنے مفید اور بزرگانہ مشوروں سے ان مجالس کو مستفید فرماتے رہے۔

حضرت بھائی جیؓ کی ذات گرامی سے ہم تمام درویشوں کو ایک بہت بڑا فائدہ یہ پہنچا کہ ذکر حبیبؑ کی مجلسیں جمی رہتی تھیں۔ اور ذکر حبیبؑ ہو اور ذاکر حضرت بھائی جیؓ ہوں تو وہ تذکرہ کتنا روحانیت افروز ہوتا ہوگا اس کی کیفیت وہی لوگ جانتے ہیں جنہوں نے ایسے تذکرے سنے ہیں۔ اور پھر عجیب بات ہے کہ حضرت بھائی جی بتقاضائے عمر ماضی قریب کی بعض باتیں تو بھول جاتے تھے لیکن زمانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی باتیں آپ کو خوب یاد ہوتی تھیں۔ گویا یہ چیز ان کا جزو زندگی بن گئی تھی۔

ایسے تذکروں میں ایک خاص بات یہ تھی کہ مثلاً حضرت بھائی جی مسجد مبارک کے اندر بیٹھے کوئی ذکر فرما رہے ہیں اور ذکر بیت الدعا سے یا کمرہ حضرت ام المومنینؓ سے تعلق رکھتا ہے تو وہ بے اختیار اُٹھ کھڑے ہوتے اور سننے والوں کو اپنے ساتھ لے جا کر وہ مقام دکھاتے۔ یہی وہ وقت ہوتا تھا کہ حضرت بھائی جیؓ کا چہرہ ایک خاص کیفیت کا حامل ہوتا تھا۔ رندھا ہوا گلا۔ رقیق آواز۔ اور آنسوؤں کو روکتے ہوئے جب آپ رُک رُک کر فرماتے "بس یہی جگہ تھی۔" تو سامعین بھی ایک لحہ بھر کے لئے تصور میں حضرت مسیح موعود السلام کی سجی ہوئی محفل دیکھ لیتے۔

لیکن اسی پر بس نہ تھی۔ میں سمجھتا ہوں قادیان کا شاید ہی کوئی درویش ایسا ہوگا جسے آپ نے

تمام مقامات مقدسہ ساتھ جا کر اُن کی پوری کیفیت کے ساتھ نہ دکھائے ہوں زمانہ درویشی میں ایک لمبے عرصہ تک آپؓ کا قیام حضرت ام المومنینؓ کے کمرہ متصل بیت الدعا میں رہا اور ہم سب درویش وقتاً فوقتاً آپؓ کی خدمت میں حاضر ہو کر ذکر حبیب سنتے یا دعا کے لئے عرض کرتے۔

ایک اور بات جو آپؓ سے خاص تھی وہ یہ تھی کہ تقسیم ملک سے قبل بھی اور بعد میں زمانہ درویشی میں بھی آپ نے نمازیں بیشتر و اکثر طور پر مسجد مبارک میں ادا کیں۔ اور وہ خاص بات یہ تھی کہ آپ مسجد مبارک کے پُرانے حصّہ میں بیٹھتے اور وہیں نماز ادا فرماتے گویا آپ تقاضائے عشق و محبت کے تحت مسجد مبارک کا وہ حصہ نماز پڑھنے کے لئے منتخب کرتے جہاں مسیحائے زماں نے نمازیں ادا فرمائیں اور مقدس مجالس جمتی رہیں۔

محبت بھی عجیب چیز ہے جو نئے نئے راستوں کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ اور اپنے معمول کو سکھاتی ہے کہ یہ بھی ایک طریق ہے۔ عشق مجازی میں بھی یہ چیز عام ہے کہ محبوب جن راستوں پر سے کبھی گزرا ہو محبّ وہاں نقش قدم تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اور خاک راہ کو سرمہ چشم بناتے ہیں...... لیکن یہاں تو عشق حقیقی کارفرما تھا اور عشق بھی اللہ تعالیٰ سے اور مسیحائے زماں سے۔ زمانہ درویشی میں جب داغ ہجرت نے دلوں پر چرکے لگائے۔ اور خاندان مقدس کے افراد ہجرت فرما گئے تو رمز کی بات جاننے والے جان سکتے ہیں کہ حضرت بھائی جیؓ نے ایک طرف یہ غم غلط کرنے کے لیے اور دوسری طرف اپنے محبوب مطاع کے سفر آخرت کے نقوش قدم تلاش کرنے کے لئے "جنازہ گاہ" کا رُخ کیا۔

"جنازہ گاہ" کیا ہے۔ محبت و عمل کی ایک یادگار ہے...... محبت کا ایک سبق اور عمل کی ایک دعوت......! اس کا نقشہ کس طرح کھینچوں کہ دامان علم تہی ہے! ایک ستر سالہ سفید ریش بہ عزم جوانانہ ہر صبح کچھ ہتھیاروں سے لیس ہو کر دار المسیح سے نکلتا ہے اور لمبا عصا ٹیکتے ہوئے دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتا باغ بہشتی مقبرہ میں پہنچتا اور گھنٹوں کام میں مصروف رہتا ہے۔ وہ ہتھیار کیا تھے۔ ایک بالٹی ایک کھرپا۔ ایک جھاڑو۔ ایک پیری اور عزم جواں......!

ستر بہتر سال عمر ہو اور پیری کا بوجھ کمر کو متاثر کر رہا ہو، تو آخر وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔ جو عزائم کو

جوانی اور توانائی بخشے؟ وہ صرف عشق ہے اور عشق ہی وہ ناقابل شکست جذبہ ہے جو ایسے کام کرا جاتا ہے کہ عقل کی قوت رسائی کے وہاں پر جل جاتے ہیں۔ حضرت بھائی جیؓ اُس وقت پُورے ستّر سال کے تھے جب انہوں نے جنازہ گاہ کو تشکیل دینی شروع کی۔ اپنے بوڑھے اور کمزور ہاتھوں سے کھرپا چلا چلا کر صفائی کرتے جھاڑو دیتے اور بالٹی میں مٹی دور سے لا کر بھرتی ڈالتے۔ اور علی الصبح کام شروع کر کے ظہر کے وقت ختم کرتے اور اس طرح اپنے تصورِ محبت کو اس جنازہ گاہ میں جہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے وصال کے بعد حضورؑ کا جسد اطہر لاہور سے لا کر رکھا گیا تھا، تھپکیاں دے دے کر بہلاتے۔ یہ وہ جذبہ عشق تھا جسے ہم یوں بھی بیان کر سکتے ہیں کہ آپ کے دل میں ایک تڑپ تھی ایک کسک تھی۔ اور ایک ٹیس رہ رہ کر اٹھتی تھی کہ کب وہ وقت آئے کہ وہ بھی اسی راہ سے گزریں جس سے آپ کا محبوب...... لاکھوں انسانوں کا محبوب امام اور آنے والے زمانے کے اربوں انسانوں کا محبوب پیشوا اپنے وصال کے بعد گزرا تھا اور ایک غلام کی حیثیت سے اپنے آقا حضرت خاتم النبیین محمد مصطفیٰ ﷺ کی محبت کی شمع لاکھوں دلوں میں پھر سے روشن کر گیا تھا۔۔۔!

بہر حال بہشتی مقبرہ کی چاردیواری کے اندر ایک گول دائرہ کی شکل میں بنی ہوئی جنازہ گاہ حضرت بھائی جیؓ کے عزمِ جواں ہمتی اور محبت و عمل کی ایک یادگار ہے۔ جو اب مستقل صورت میں موجود ہے اور انشاء اللہ تاریخ احمدیت میں اسے ایک اہمیت حاصل رہے گی۔ کیونکہ یہ صرف جنازہ گاہ ہی نہیں ہے بلکہ ایک نشان ہے اس کٹھن منزل کا جسے خلافت کی رہبری میں قطع کیا جاسکتا ہے۔ اسی گول دائرے کے اندر جہاں یہ نشاندہی حضرت بھائی جیؓ نے کر دی ہے کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا جسدِ اطہر فلاں جگہ رکھا گیا تھا وہاں آم کے چھ درختوں پر نشانات لگا کر یہ نشاندہی بھی کر دی ہے کہ خلافت اولیٰ کی بیعت فلاں جگہ ہوئی تھی۔ گویا اسی دائرہ کے اندر وہ مقام ہے جہاں نبوت، خلافت سے معانقہ کر کے اور جماعت کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں دے کر رخصت ہو رہی ہے۔ نبوت اور خلافت کی یہ یکجائی بھی بڑا عجیب منظر پیش کرتی ہے کاش! یہ منظر ہمارے ان احمدی کہلانے والے بھائیوں کو بھی یاد ہو جو بعض غلط فہمیوں کا شکار ہو کر ہم سے بچھڑ گئے۔ اور ہم سے بچھڑ جاتے تو کوئی بات نہ تھی۔ وہ اپنے مرکز سے دُور ہو گئے۔ اے کاش! وہ لوٹ

آئیں کہ ابھی شام نہیں ہوئی۔ وہ ہمیں کچھ بھی کہیں۔ لیکن ہم ایک محبت کے ساتھ ان کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ

آخر کنند دعویٰ حب پیمبرم

ہمارے واجب الاحترام بزرگ حضرت بھائی جیؓ دسمبر سنہ ۶۰ء میں جلسہ سالانہ ربوہ میں شرکت کے لئے پاکستان تشریف لے گئے۔ اور جلسہ ربوہ کے بعد کراچی جاتے ہوئے بحالت سفر ٹرین میں ہی وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

آپؓ کی وفات اور آپ کی نعش کے قادیان لائے جانے کے ایمان افروز حالات بدر ۱۲/۱/۶۱ میں بڑی تفصیل کے ساتھ شائع ہو چکے ہیں۔ لیکن یہاں میں پھر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا جذبہ عشق و وفا ہی تھا جو نہایت غیر معمولی اور مایوس کن حالات میں آپ کی نعش کو قادیان پہنچانے کا باعث ہوا۔ اور پھر عشق کی کامرانی دیکھئے کہ وہ نعش لاہور سے ہوتی ہوئی قریباً انہی راستوں سے گزر کر قادیان پہنچی (بالخصوص بٹالہ سے قادیان تک) جن راستوں سے سیّدنا حضرت اقدس مسیح موعود علیہ السلام کا جسد اطہر لایا گیا تھا۔ ۶ جنوری سنہ ۶۱ء کو جب آپ کی وفات کی افسوسناک اطلاع تار کے ذریعہ سے قادیان پہنچی تو یہاں کا ہر شخص ایک طرف افسوس اور غم میں ڈوب گیا اور دوسری طرف یہ صدمہ بہت بھاری محسوس ہو رہا تھا کہ ہمارے بھائی جی اپنی ساری عمر قادیان کی خدمت میں گزار کر ایک دوسرے ملک میں فوت ہوئے جہاں سے اب نعش کے لائے جانے کا بظاہر جلد کوئی امکان نہیں۔

لیکن جب اگلے روز یہ اطلاع پہنچی کہ بھائی جیؓ کی نعش لائی جا رہی ہے تو ہمارا یہ صدمہ کم ہو گیا اور پھر اللہ تعالیٰ نے یہ فضل کیا کہ نعش ٹرک کے ذریعہ رات کے قریباً نو بجے قادیان پہنچ گئی۔ اور اگلے روز اسی جنازہ گاہ میں نماز جنازہ ادا کر کے حضرت بھائی جی کی بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۳ میں جو مزار مبارک کی چاردیواری سے متصل جانبِ غرب ہے اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا گیا۔

جب آپؓ کا تابوت قبر میں اتارا جا رہا تھا تو وہ منظر بھی بڑا عجیب تھا۔ ہر درویش ہچکیاں لے لے کر رو رہا تھا۔ اور آپ کی بلندیٔ درجات کے لئے دُعائیں کر رہا تھا۔ اور یوں معلوم ہوتا تھا کہ

قادیان کے تمام درویشوں کا کوئی نہایت قریبی عزیز فوت ہوگیا ہے۔اور یہ بات تھی بھی ٹھیک۔کیونکہ آپ تمام درویشوں کے بزرگ ہی نہ تھے بلکہ سب کے خیر خواہ اور ہمدرد بھی تھے۔یہی وہ الوداعی منظر تھا' یہی وہ آنسوؤں کی لڑیاں تھیں' یہی وہ عقیدت ومحبت کے پھول تھے جنہیں دیکھ کر حضرت بھائی جیؓ کے فرزند نے فرمایا تھا کہ

"آج درویشوں نے ہمارے ابا جی کی تدفین کے موقعہ پر محبت کا جو اظہار آنسوؤں کی زبان میں کیا ہے اس سے ہمارا صدمہ بہت کم ہوگیا ہے اور ہم بڑے تعجب کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ درویش برادری ایک انوکھی برادری ہے۔"

اللہ تعالیٰ حضرت بھائی جیؓ کے درجات کو بلند فرمائے اور ہم سب کو اُن کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق دے۔آمین۔

(بدر ۱۴ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

حضرت حاجی محمد الدین صاحب تہالویؓ

ہرکارہ میرے ہاتھ میں تار دے کر اور دستخط کروا کر چلا گیا تو میں نے لفافہ چاک کر کے تار کو پڑھا۔کیونکہ میں جانتا تھا کہ وہاں بھی تار مجھے ہی پڑھنا ہے۔تار پڑھتے ہی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور سر چکرانے لگا۔ایک جوان اور ہونہار فرزند کی وفات کی رُوح فرسا خبر تھی۔اور تار عدن سے کسی نے مرحوم کے بوڑھے باپ کے نام دیا تھا میں عجیب تذبذب کے عالم میں تھا کہ یہ تار کس کس طرح بوڑھے بزرگ کو پہنچاؤں۔اور یہ دردناک خبر کیسے سُناؤں۔مگر تار تو بہر حال پہنچانا تھی۔میں اپنے ذہن میں تسلی آمیز الفاظ کو ترتیب دیتا ہوا آہستہ آہستہ مسجد مبارک کی سیڑھیاں طے کرنے لگا۔مگر میرے قدم بوجھل ہوئے جا رہے تھے جونہی میں نے مسجد مبارک میں قدم رکھا' وہ بزرگ مسجد میں ہی ٹہلتے ہوئے سامنے نظر آئے۔میں جی کڑا کر کے اُن کے پاس پہنچا۔مجھے دیکھ کر وہ دری پر بیٹھ گئے۔انہوں نے سمجھا ہوگا کہ میں حسب عادت دُعا کی درخواست کرنے آیا ہوں۔

میں نے ایک مکرر نگاہ تار پر ڈالی۔اور پھر اس پچھتر سالہ بزرگ کو دیکھا۔مجھے ترس آگیا۔اور میں اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میں یہ خبر بدلے کر ان کے پاس کیوں پہنچا ہوں......لیکن کسی نے تو یہ خبر پہنچانی ہی تھی...... یہ خیال کر کے میں نے عرض کیا' حاجی صاحب! یہ تار آیا ہے۔دریافت فرمایا۔کہاں سے کس کا تار ہے؟ میں نے جھجکتے جھجکتے تار کے مضمون سے اطلاع دی کہ عدن سے تار آیا ہے کہ آپ کے فرزند ڈاکٹر محمد احمد صاحب وفات پا گئے ہیں۔

صبر وثبات کا وہ مظاہرہ میں کبھی نہ بھول سکوں گا۔رضائے الٰہی کے سامنے سر جھکا دینے کی ایسی مثال بہت ہی کمیاب ہے۔پچھتر سالہ بوڑھا باپ اپنے جوان ہونہار فرزند کی وفات کی خبر سُن کر ایک بار تو کمر ٹوٹتی ہوئی محسوس کرتا ہے۔لیکن حضرت حاجی صاحب نے جو الفاظ کہے وہ نہایت مختصر سا اور جامع جملہ تھا اور یہ وہی تھا جس کی خدا نے تلقین فرمائی ہے۔یعنی انا للہ وانا الیہ راجعون۔پڑھنے کے بعد اُنہوں نے فرمایا:

"اچھا خدا کی مرضی"

اُن کے چہرے پر حزن وملال کی پرچھائیاں ضرور تھیں۔ کیونکہ جگر کا ٹکڑا دائمی جُدائی دے کر چل بسا تھا۔ لیکن زبان نے وہی ادا کیا جس کا اُسے خدا کی طرف سے حکم تھا۔ میں اس وقت سخت حیرت کے عالم میں اُن کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پچھتر سالہ دور افتادہ بُوڑھا اس المناک خبر کی تاب نہ لاکر چیخیں مار اُٹھے گا۔ لیکن نہیں۔ یہ میری نادانی تھی۔ کیونکہ یہ میرا ایک عامی تجزیہ تھا۔ جو حقائق کی کسوٹی پر قطعی غلط اُترا تھا۔ اور اس لئے غلط اُترا تھا کہ میرے سامنے وہ شخص بیٹھا تھا جس نے قادیان میں نازل ہونے والے آسمانی نور سے براہ راست اکتساب نُور کیا تھا۔ میں ایک گمراہ سا تصور لے کر اُس کے پاس پہنچا تھا۔ لیکن اس کا وہ مختصر سا جملہ میری ہدایت کا باعث بن گیا۔ اس لئے کہ وہ اس صف کا بزرگ تھا جس کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ اصحابی کالنجوم بایّھم اقتدیتم اھتدیتم۔ یہ تھے ہمارے بہت ہی بزرگ حضرت حاجی محمد الدین صاحبؓ تہالوی درویش جو کچھ روز قبل ربوہ میں وفات پا گئے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت حاجی صاحب موضع تہال متصل کھاریاں ضلع گجرات (حال پاکستان) کے رہنے والے تھے۔ اور اسی نسبت سے وہ تہالوی کہلاتے تھے۔ میں انہیں ۲۹۔۱۹۲۸ء سے جانتا تھا جبکہ میں اپنے ماموں چودھری لعل خاں صاحب (مرحوم) جنرل سیکرٹری جماعت احمدیہ کھاریاں کے گھر میں رہ کر تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ حضرت حاجی صاحب میرے ماموں صاحب مرحوم کے ہاں اکثر آیا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانہ میں مَیں چونکہ احمدی بھی نہ تھا اور شعور بھی کم تھا اس لئے میں صرف یہی جانتا تھا کہ یہ تہال والے میاں محمد الدین صاحب ہیں۔ میرے ماموں صاحب اکثر اوقات حاجی صاحب کے اخلاص تقویٰ اور نیکی کا ذکر کیا کرتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان ایام میں مجھے ان الفاظ کا مفہوم بھی معلوم نہ تھا۔ البتہ اتنا یاد ہے کہ حضرت حاجی صاحب کا جو لباس ۱۹۲۹ء میں تھا وہی لباس اور وضع قطع ۱۹۶۵ء میں تھی۔

حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے بارہ میں احادیث میں جو یہ پیشگوئی پائی جاتی ہے کہ وہ خزانے تقسیم کریں گے۔ اس کے کئی بطون اور مفاہیم ہیں۔ لیکن اگر اسے ظاہری معنوں سے لیا جائے تب بھی یہ پیشگوئی روز روشن کی طرح پوری ہو چکی ہے۔ کیونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام

اور احمدیت کی برکت سے اللہ تعالیٰ نے ظاہری طور پر بھی سینکڑوں ہزاروں خاندانوں کو قعر گمنامی سے نکال کر مشاہیر کی صف میں کھڑا کر دیا ہے۔ اسی حقیقت کی طرف حضرت حاجی صاحب کے فرزند اکبر میجر سلطان احمد صاحب عدن نے اپنے ایک حالیہ خط میں اشارہ کیا ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صداقت ثابت ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے اس بزرگ درویش کے ذکر میں اس امر کو حیطہ تحریر میں لا رہا ہوں۔ حضرت حاجی صاحبؓ اکثر اللہ تعالیٰ کے فضلوں اور انعاموں کا ذکر کرتے ہوئے اپنی ان دونوں حالتوں کا ذکر فرمایا کرتے تھے اور ؎

نہد شاخ پُر میوہ سر بر زمیں

کے مصداق اللہ تعالےٰ کے حضور سجدہ ریز ہوا کرتے تھے۔

حاجی صاحبؓ نے ۱۹۰۳ء میں سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سفر جہلم کے موقع پر جہلم میں حضور انورؑ کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ وہ اس واقعہ کو بڑے ہی والہانہ انداز میں سُنایا کرتے تھے۔ آپ فرماتے تھے کہ جہلم والی بیعت

پگڑی والی بیعت

کہلاتی ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السّلام کے اس سفر میں اس قدر زیادہ لوگوں نے بیعت کی تھی کہ حضورؑ کے ہاتھ میں ہاتھ دینے کا موقعہ تو کئی روز تک بھی ملنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے بیعت کرنے والوں نے اپنی پگڑیاں اُتار کر اور ایک دوسری سے گانٹھ کر لمبی پھیلا دی تھیں۔ بیعت کرنے والے آتے جاتے اور پگڑیوں پر ہاتھ رکھ کر بیعت کر کے ہٹتے جاتے۔ یہ واقعہ میرے قلم سے کہاں اس ڈھب کا بن سکتا ہے جس والہانہ اور بے ساختہ انداز میں حاجی صاحبؓ سُنایا کرتے تھے۔ یہ واقعہ سُناتے وقت وہ ہاتھ سے اشارہ کر کے سادگی خلوص اور رقّت کے ساتھ بتایا کرتے تھے کہ

"اتھے حضرت صاحب بیٹھے ہوئے سی"

(یعنی یہاں حضرت مسیح موعود علیہ السلام بیٹھے ہوئے تھے) یہ کیسے پروانہ صفت لوگ تھے جو اپنے محبوب کے تصور کو ساتھ لئے پھرتے تھے۔ اور کتنے خوش بخت تھے کہ انہوں نے مامور زمانہ

کے چہرہ مبارک کو اپنی آنکھوں سے دیکھا اس کی زبان مبارک سے باتیں سُنیں، اس کے قُرب سے فیض حاصل کیا۔ اور اس آسمانی نُور سے اپنے ایمان کی شمعیں براہ راست روشن کیں۔ مگر تصوّر کی گرفت میں اس زمانے کے حالات کس طرح آ سکتے ہیں۔ جب مخالفتوں کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر......ایک بیکراں سمندر موجزن تھا۔ جب احمدی کہلانا اپنی موت کے فتوے پر دستخط کرنے کے مترادف تھا۔ اور پھر کسی ایسے غریب آدمی کا احمدی ہو جانا تو بے شمار آفتوں کو دعوت دینا تھا جو ظاہری اعتبار سے اپنے گاؤں میں کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔ اس زمانہ میں حضرت حاجی صاحبؓ کا بیعت کرنا واقعی ایک بہت بڑی جرأت اور حوصلہ کا کام تھا۔ اور پھر اپنے گاؤں والوں کی اذیتیں برداشت کر کے ثابت قدم رہنا تو ایک کارنامہ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بھی ان کے ثبات و استقلال کو اس قدر نوازا کہ مال و اولاد سے گھر بھر دیا۔

حضرت حاجی صاحبؓ کو حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کا صحابی ہونے کا شرف تو حاصل ہی تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اُنہیں حج بیت اللہ شریف اور زیارت مدینہ منوّرہ کا شرف بھی عطا کیا ہوا تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں درویشی کی نعمت عطا کی اور انہوں نے اپنی درویشی کے سترہ طویل سال قادیان کی مبارک بستی میں یوں گزارے کہ ان کی زندگی قابل صد رشک تھی۔ اور وہ زندگی کیا تھی الالیعبدون کی تفسیر تھی۔ تہجد۔ اشراق اور پنجگانہ نمازوں میں اس قدر التزام تھا کہ جیسے اُن کا اوڑھنا بچھونا ہی یہی ہو۔

ایک سعادت انہیں یہ بھی حاصل تھی کہ مسجد مبارک میں ایک لمبے عرصہ تک روزانہ دو تین نمازوں میں امام الصلوٰۃ ہوتے رہے۔ اور پھر سیّدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار مبارک پر جو اجتماعی دُعائیں ہوا کرتی تھیں وہ اکثر طور پر آپؓ ہی کروایا کرتے تھے۔

آپ نے ابلتی ہوئی ہنڈی کی آواز سنی ہوگی۔ حضرت حاجی صاحبؓ روزانہ صُبح کی نماز کے بعد مزار مبارک پر جا کر جب دعا کرتے تھے اس وقت اُن کی وہی کیفیت ہوتی تھی۔ دُعا کی طوالت اور قلبی رقّت کا ایک عجیب منظر ہوتا تھا۔ یوں تو درویش بھائی بھی اکثر ان کی خدمت میں دعا کے لئے درخواست کرتے رہتے تھے۔ لیکن حاجی صاحب کی بزرگی کی ایک بہت بڑی سند یہ تھی کہ سیّدی حضرت قمر الانبیاء مرزا بشیر احمد صاحبؓ قادیان کے جن چند بزرگوں کو جماعتی ترقیات کے لئے

دُعاؤں کے خطوط تحریر فرمایا کرتے تھے ان میں سے ایک حضرت حاجی صاحبؓ بھی تھے۔

حاجی صاحب بڑے فروتن اور سادہ طبع بزرگ تھے۔ ان کا لباس سادہ اور صاف سُتھرا ہوتا تھا۔ سادگی، خود فراموشی اور تعلق باللہ میں گم رہنے کے باعث بعض اوقات یہ بھی دیکھا گیا کہ پاؤں میں مختلف قسم کے جوتے پہنے ہوتے تھے۔ یعنی دائیں پاؤں میں گُرگابی اور بائیں پاؤں میں دیسی وضع کا جُوتا۔ سوٹی ہمیشہ ہاتھ میں رکھتے اور تیز تیز چلتے تھے۔ اور نگاہیں ہمیشہ نیچی رکھتے تھے۔

آپ بڑے ہی التزام کے ساتھ سر اور ڈاڑھی کے بالوں میں مہندی لگایا کرتے تھے۔ سردی ہو یا گرمی، یہ کبھی نہیں دیکھا گیا کہ سفید بالوں کے کھونٹے نیچے سے نکل آئے ہوں۔ آپ کی صحت عام طور پر ہمیشہ اچھی رہی۔ لیکن اسی سال بندش پیشاب کے مرض نے ایسا غلبہ پایا کہ وہ فریش ہو کر رہ گئے۔ وہ اپنے بیوی بچوں سے ملاقات کے لئے پاسپورٹ پر ربوہ گئے ہوئے تھے۔ وہیں بیمار ہو گئے اور وہیں وفات پائی اور وہیں بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔

حضرت حاجی صاحبؓ نے اپنی درویشی کا اکثر حصّہ دار المسیح کے اندر گزارا۔ ایک لمبے عرصہ سے آپؓ کا قیام مسجد مبارک کی چھوٹی سیڑھیوں سے ملحق حضرت اماں جانؓ کے کمرہ میں تھا۔ آپ دن رات کا بیشتر حصّہ مسجد مبارک میں ہی گزارتے تھے۔ اور نمازوں نوافل اور دعاؤں میں مصروف رہتے تھے۔

اپنے اپنے ذوق کی بات ہے۔ حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب سلمہ اللہ تعالےٰ حضرت ام ناصرؓ والے مکان میں مقیم ہیں۔ وہ جب مسجد میں تشریف لاتے ہیں تو اپنا جوتا یا چپل مسجد مبارک کے ساتھ والے مسقف حصّہ میں اتارتے ہیں۔ حضرت حاجی صاحبؓ ہمیشہ تاک میں رہتے۔ جب صاحب زادہ صاحب جُوتا اُتار کر مسجد میں تشریف لے آتے تو حاجی صاحب جوتے یا چپل کو جوڑ کر سیدھا کر کے پیچھے کی طرف موڑ کر رکھ دیتے یہ ایک چھوٹی سی بات ہے لیکن اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کے دلوں میں خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے افراد کے لئے احترام وعقیدت کے کتنے گہرے جذبات تھے۔ میں نے حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانیؓ کو اکثر صاحب زادہ صاحب موصوف سے ملاقات کرتے دیکھا۔ ملاقات کے وقت ان کی عجیب کیفیت ہوتی تھی۔ احترام سے قامت میں خم ڈال کر وہ نہایت ہی مؤدّب انداز

میں دست بوسی کیا کرتے تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے کہ انہوں نے احمدیت کی نعمت کو بڑی ہی محنت، تکلیف اور قربانیوں سے براہ راست حاصل کیا تھا۔ اور ان کے دلوں میں خاندان مقدس کے چھوٹے بڑے افراد کی بیحد عزت تھی۔ حضرت حاجی صاحبؓ کی اس کیفیت کا اندازہ اُوپر والے واقعہ سے ہوسکتا ہے۔ وہ حضرت مسیح موعود علیہ السّلام کے صحابی تھے۔ اور معمر بزرگ تھے۔ لیکن صاحب زادہ صاحب موصوف کے جوتے سیدھے کر کے رکھنے میں اپنی سعادت سمجھتے تھے۔ اور اس سعادت میں شک بھی کسے ہوسکتا ہے......!

حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانیؓ درویش کی وفات کے بعد حضرت حاجی صاحبؓ کا وجود ہم درویشوں کے لئے بڑا ہی غنیمت تھا۔ کیونکہ یہ لوگ دُعائیں کرتے نہیں تھے بلکہ دُعاؤں کی مشین تھے۔ اور ظاہر ہے کہ اس دینی اور روحانی ماحول میں دعاؤں کی کتنی بڑی قدر و قیمت ہے۔ بہر حال ہمارا ایک بزرگ درویش ہم میں سے اُٹھ گیا۔ جو ایسے لوگوں میں سے تھا جس کی دُعاؤں کے ہاتھوں میں بجلیوں کی باگیں ہوتی ہیں۔

حضرت حاجی صاحبؓ، جیسا کہ اُوپر ذکر آچکا ہے پاسپورٹ پر ربوہ گئے ہوئے تھے۔ اور شدید بیماری کی حالت میں یا کم از کم وفات کے بعد ہی ان کی نعش کو بڑی آسانی کے ساتھ قادیان پہنچایا جاسکتا تھا۔ کیونکہ وہ قادیان کے تھے اور قادیان کی امانت تھے۔ خدا جانے ان کے ورثاء نے اس طرف توجہ کیوں نہ کی۔ یا انہیں کیا مجبوری پیش آ گئی۔ اس کا ہم سب درویشوں کو افسوس رہا۔

حضرت حاجی صاحبؓ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی دینی اور دنیوی نعمتوں سے نوازا ہوا تھا۔ آپؓ کی ساری اولاد خدا کے فضل سے احمدیت اور خلافت سے گہری وابستگی رکھتی ہے۔ آپ کے بڑے فرزند میجر سلطان احمد صاحب اس وقت عدن میں ہیں اور عزیز مبارک احمد صاحب ایم۔اے ربوہ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سب کو اپنے فضلوں اور نصرتوں سے نوازے اور حاجی صاحبؓ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے۔ آمین

اے خدا برتربت او بارش رحمت ببار

(بدر ۲ ستمبر ۱۹۶۵)

حضرت بابا سلطان احمد صاحبؓ

سکنہ نواں پنڈ بہادر

ایک اور دیوانہ دیکھئے جس نے براہ راست حضرت مسیح موعود علیہ السلام سے دیوانگی کا درس لیا تھا۔ وہ دیوانگی جس پر لاکھوں فرزانگیاں قربان ہوں۔ یہ حضرت بابا سلطان احمد صاحبؓ ہیں جنہیں حضورؑ کا صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا۔ کیسے گراں قدر لوگ تھے یہ جو اپنوں اور بیگانوں کی بھڑکائی ہوئی مخالفت کی آگ میں کود گئے۔ رشتہ دار چھوڑے۔ گھر بار چھوڑے۔ جائدادیں تج دیں۔ اور مستانہ وار اسلام کی سربلندی کا ناقابل شکست عزم دلوں میں لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مقدس ہاتھ پر جمع ہو گئے۔ اور اپنے خون سے...... اپنے جذبات کے خون سے...... اپنی اولادوں اور رشتہ داروں کی محبت کے خون سے احمدیت کی بنیادیں استوار کیں۔ اور اپنے اپنے رنگ میں قربانی، ایثار اور ثبات قدم کا وہ نمونہ دکھایا کہ اسی کی روشنی میں آج بھی ہم خدا کے فضل سے آگے بڑھے چلے جارہے ہیں۔ وہ دور آگے...... بہت آگے، ہمیں کچھ روشنیاں نظر آرہی ہیں...... وہ ایک قافلہ بڑھے چلا جارہا ہے نشان منزل چھوڑتا، کانٹوں کو راستے سے ہٹاتا...... یہ صحابہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کا قافلہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک نشان راہ ہے۔ ہر ایک سنگ میل ہے اور ان میں سے ہر ایک اپنے اپنے رنگ میں ایک روشن چراغ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ہزاروں ہزار رحمتیں ہوں ان لوگوں پر جنہوں نے احمدیت اور اسلام کے بقاء و احیاء کے لئے بڑے بڑے مصائب کا مردانہ وار مقابلہ کیا اور نہایت تلخ جرعات حلق سے اتار کر بھی انہیں عسل مصفّٰی کے گھونٹ سمجھا۔

۱۹۴۸ء میں جب مسجد مبارک میں درویش صحابہ کرام کی مجالس ذکر منعقد ہونے لگیں۔ اور ذکر حبیب و منتخب موضوع ہم خامکاروں کے ایمانوں کو جلائیں بخشنے لگا۔ تو صحابہ کرام اپنے قبول احمدیت کے واقعات یا جری اللہ فی حلل الانبیاء کی پاک صحبتوں کے حالات سُنایا کرتے تھے اور خاکسار وہ کارروائی نوٹ کیا کرتا تھا۔ آخر باری ایک سادہ لوح بزرگ کی آئی۔ یعنی حضرت بابا سلطان احمد صاحب جو ایک معمولی خواندہ تہ بند پوش دیہاتی وضع کے بزرگ تھے۔ جب وہ ذکر

حبیب پر بولنے کے لئے اُٹھے تو میں سوچنے لگا کہ باباجیؓ جو کم تعلیم یافتہ بھی ہیں اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صحبت بھی کم عرصہ اٹھائی ہے۔ کس قسم کے واقعات سُنائیں گے......! حضرت باباجیؓ نے اپنے قبول احمدیت کا واقعہ سُنایا جو اس وقت ذہن میں متحضر نہیں۔ لیکن دوسری بات اپنے انوکھے پن کی وجہ سے یاد رہ گئی۔ یہ انوکھی بات اُن کی ایک لطیف اُپج تھی اور نرالا طریقہ تبلیغ تھا

کسی اَور صحابی کے متعلق ذکر آتا ہے کہ وہ بالکل ان پڑھ تھے اور تانگہ بان تھے وہ مرکز سے اخبار باقاعدہ منگایا کرتے تھے۔ اور اُن کے تانگہ میں جو لوگ سوار ہوا کرتے تھے اُن سے پڑھوا کر سُنتے تھے جس سے تبلیغ کا فرض بھی ادا ہو جاتا تھا اور ان کا اپنا علم بھی بڑھتا تھا۔ بہر حال ایک جذبہ عشق وصدق وخلوص نے اُن سے یہ ایجاد کروائی تھی۔ مگر

ہر گلے را رنگ و بُوئے دیگر است

میں جس پُھول کا ذکر کر رہا ہوں اُس نے بھی اپنی خوشبو پھیلانے کے لئے عجیب طریق اختیار کیا تھا۔ حیرت آتی ہے کہ یہ کس قسم کے عشق و محبت کے قلزم میں ڈوبے ہوئے لوگ تھے۔ انہوں نے ایک جلوہ طور دیکھا اور پھر لوگوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر انہیں سر طور لے گئے۔ آج تو احمدیت قبول کرنا گویا بالکل ”کھیر“ ہے۔ آج تو خُدا کے فضل سے بڑی آسانیاں ہیں۔ لیکن اُس زمانہ میں یہ کام کوہ کندن تھا۔ اور پھر احمدیت کی تبلیغ کرنا تو بڑے ہی دل گردے کا کام تھا۔ لیکن عشق تو ہر دور میں بے دھڑک آتش نمرود میں کود جایا کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت بابا سلطان احمد صاحب نے سنایا کہ میں جن ایام میں احمدیت میں داخل ہوا تھا مخالفتوں کے طوفان شباب پر تھے۔ میں بہت معمولی پڑھا لکھا تھا اور ایسی شخصیت اور حیثیت بھی نہ رکھتا تھا کہ کوئی مجلس منعقد کر کے تقریر کر سکتا۔ لیکن میرے دل میں ایک تڑپ تھی کہ وہ شعلہ طور جو میں نے قادیان کے فرازوں پر دیکھا ہے وہ دوسروں کو بھی دکھاؤں۔ لیکن یہ سمجھ نہ آتی تھی کہ کیسے؟ اور کس طرح اپنی نگاہوں میں بسے ہوئے ان لمعات نور کو دوسروں کی نگاہوں میں منتقل کروں۔ میں سوچتا رہتا اور سوچتا رہتا۔

آخر ایک ترکیب میرے ذہن میں آ گئی۔ میں نے آواز اچھی پائی تھی۔ اور

۱؎ ”ہیر وارث شاہ“ بڑی خوش الحانی سے پڑھ سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ طریق اختیار کیا کہ مختلف دیہات میں چلا جاتا اور کسی بارونق مقام پر کھڑے ہو کر اکیلے ہی ہیر پڑھنا شروع کر دیتا۔ میری آواز سن کر لوگ جمع ہونے لگتے۔ اور جب کافی مجمع ہو جاتا تو میں ہیر پڑھنا بند کر دیتا۔ اور لوگوں سے کہتا دیکھو بھائیو! وہ مہدی جس کا مدت سے انتظار تھا قادیان میں نازل ہو چکا ہے۔ جاؤ اور جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔۔۔! چنانچہ یہ طریق بڑا کامیاب رہا۔ اور خدا کے فضل سے میں نے بہت سے لوگوں تک پیغام حق پہنچایا۔

آپؓ کو تبلیغ کا بہت شوق تھا۔ اور بات کرنے کا ڈھنگ بھی آتا تھا۔ اس بڑھاپے میں بھی جبکہ آپؓ کی عمر ۸۰ سال کی ہو چکی تھی۔ اور آپؓ اکثر بیمار بھی رہتے تھے اپنی خدمات آنریری طور پر نظارت دعوۃ تبلیغ کے سپرد کیں۔ اور کچھ عرصہ تک گورداسپور اور جالندھر وغیرہ اضلاع میں جا کر تبلیغ کرتے رہے۔

آپؓ نواں پنڈ بہادر ضلع گورداس پور کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد درویشی کی سعادت پائی۔ صحابی تو پہلے ہی تھے نور علی نور ہو گئے۔ قد میانہ تھا۔ باریک نقوش تھے۔ بات چیت کا اسلوب زوردار اور دلپذیر ہوتا تھا۔ ۸۴ سال کی عمر میں ۱۲ مارچ ۱۹۵۸ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔ مرحوم کے ایک فرزند مکرم چودھری عزیز احمد صاحب ربوہ میں صدر انجمن احمدیہ کے کارکن ہیں۔ (بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا صدر الدین صاحب قادیانیؓ

چمنستان عالم کی زمین بھی کیسے کیسے عمدہ اور خوش رنگ پھول کھلاتی ہے۔ جن کی خوش رنگی اور خوشبو عرصہ دراز تک دماغ میں بسی رہتی ہے۔ اور جن پر خود بہار بھی فخر کرتی ہے۔ اگر ہم کسی موقعہ پر کوئی خاص قسم کی خوشبو سونگھ لیں جس سے ہمارے دل کو فرحت اور دماغ کو تازگی پہنچے تو ایک عرصہ بعد تک جب کبھی کہیں خوشبویات کا ذکر چھڑ جائے تو وہ فرحت و تازگی بخشنے والی خوشبو

۱؎ ”ہیر وارث شاہ“ پنجاب کی ایک نہایت مقبول منظوم عشقیہ کہانی ہے اور آج بھی ہر جگہ پڑھی جاتی اور مقبول عوام ہے اور اس کی آواز سنتے ہی دیہاتی جمع ہو جاتے ہیں۔

ہمیں ضرور یاد آجاتی ہے۔

حضرت بابا صدرالدین صاحبؓ قادیانی جو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پرانے صحابہ میں سے تھے نہایت مخلص سادہ طبع اور نیک سیرت بزرگ تھے یہ ہو نہیں سکتا کہ حضرت میاں صدر الدین صاحبؓ کا ذکر آئے تو ساتھ ہی ہمیں اُن کی دیانت و امانت کا خیال نہ آجائے جو اُن کا طرہ امتیاز تھا۔ یوں تو اللہ تعالیٰ کے فضل سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابہ میں سے ہر ایک ہی ایمان و اخلاص کے اعلیٰ مقام پر ہے۔ لیکن بابا صدرالدین صاحبؓ اور امانت و دیانت تو گویا ہم معنی الفاظ ہو گئے تھے۔ یہ اُن معماران احمدیت میں سے تھے جنہوں نے احمدیت کی بنیادوں میں اپنا خون پسینہ لگایا۔ اور اس زمانہ میں ایمان لائے تھے جب ایمان لانے اور مصلوب ہونے کا ایک سا تصور ہوتا تھا۔ اور پھر ایمان لانے کے بعد اپنے اندر ایسا تغیر پیدا کیا جیسا کہ آسمان چاہتا تھا۔

حضرت بابا صاحبؓ قادیان کے قدیمی باشندہ تھے اور قوم کے کمہار تھے۔ لیکن کمہار تو ایک پیشہ ہے۔ خدا جانے اسے قوم یا ذات کیوں کہا جانے لگا تھا۔ اور پھر خدا کے حضور تو امتیازی شرف کا معیار ہی دوسرا ہے۔ ان اکرمکم عنداللہ اتقٰکم ۔ وہاں تو باریابی صرف اور صرف تقویٰ کو حاصل ہے۔ اور قومیں تو میزان کے پلڑے پر کھڑی مُنہ دیکھتی رہ جائیں گی۔

حضرت بابا صاحب شروع ایام میں تو اپنے پیشے کا کام ہی کرتے تھے۔ لیکن بعد میں انہوں نے ریتی چھلہ میں ایک دوکان آٹے اور دالوں کی کھول لی تھی۔ اور اُن کی امانت و دیانت کی وجہ سے یہ کاروبار خوب چلا۔ چنانچہ تقسیم ملک سے کچھ قبل کاروبار میں نقصان ہو گیا تھا۔ بابا جی نے کوئی جنس خرید کی، بھاؤ اچانک گر گئے۔ ابھی اس جنس کی قیمت ادا کرنی تھی۔ چنانچہ مقروض ہو گئے۔ اسی اثناء میں مُلک تقسیم ہو گیا۔ اور کاروبار جاتا رہا۔ اور بابا جی محض درویشی وظیفہ پر گذارہ کرنے لگے۔ لیکن آفرین ہے اس اسی سالہ بوڑھے کی جواں ہمتی پر کہ اس نے زمانہ درویشی ہی میں وہ قرض بے باق کیا۔ اس طرح کہ انہوں نے لنگر خانہ کو آٹے اور دالوں کی سپلائی شروع کر دی۔ ساری اجناس وہ اپنے بوڑھے کمزور ہاتھوں سے صاف کرتے اور خود چکی چلا کر دالیں بناتے اور یوں اس اسّی سالہ پیر فرتوت نے اپنی جھریوں والی کمزور بانہوں کے بل پر سارا قرض اُتار دیا

بعض قرض خواہ کہتے تھے کہ آپ کے حالات تبدیل ہو گئے ہیں اس لئے قرض معاف کیا جاسکتا ہے۔ لیکن مرحوم کی غیرت نے اسے گوارا نہ کیا۔ اور سب کو یہی جواب دیا کہ میں قرض کا بوجھ سر پر لئے قبر میں نہیں جانا چاہتا، چنانچہ یہی عزم تھا جو قرض سے سبکدوشی کا باعث ہوا۔

ایک صحابی کا ذکر ہو رہا ہو تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ وہ نماز روزے کا پابند تھا بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ایک عام احمدی کے ذکر میں بھی ایسا کہنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن چونکہ ایک خاص بات درمیان میں آگئی ہے اس لئے ذکر کر دیتا ہوں کہ وفات سے چار پانچ سال قبل مرحوم بابا جیؓ کی بینائی جاتی رہی تھی۔ لیکن وہ نور ایمان کا ہاتھ تھامے مسجد میں برابر پہنچتے تھے تا آنکہ ضعف پیری نے منزل کے قریب پہنچ جانے کے باعث قدم بالکل ڈھیلے اور ماؤف کر دیئے۔

مرض الموت کوئی خاص تو لاحق نہیں ہوا۔ بس موت خود ہی مرض بن گئی تھی۔ معمولی سا ضعف ہوا۔ حضرت مولوی عبدالرحمٰن صاحب امیر مقامی کو بلوایا۔ وہ تشریف لائے تو فرمایا کہ اب میں محسوس کر رہا ہوں کہ میرا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ حضرت امیر صاحب بھی خوب سمجھتے تھے کہ اب سانس آمد و شد کے مرحلہ میں ہے۔ تاہم تسلی دیتے رہے۔ اس کے چند گھنٹوں بعد صبح سویرے موت کی ایک ہی ہچکی نے جسم و جاں کا ناطہ توڑ دیا۔ اور ایک نجم احمدیت ہم میں سے اُٹھ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم بابا صاحبؓ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ اُن کے ایک بیٹے میاں محمد عبداللہ صاحب نے بھی درویشی کی سعادت پائی جو آجکل لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں نان پز کا کام کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں بھی اپنے خوش نصیب باپ کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق بخشے۔ مرحوم بابا صاحب کے دُوسرے بیٹے میاں عبدالرحمٰن صاحب دارالہجرت ربوہ میں رہائش پذیر ہیں۔

بابا صاحب مرحوم دراز قد اور خوبصورت خدوخال رکھتے تھے۔ کسی مستقل بیماری کے باعث موسم گرما میں بھی روئی دار واسکٹ پہنتے۔ اور پنڈلیوں پر گرم اونی پٹیاں باندھتے تھے۔

قریباً ۹۱ سال کی عمر میں ۴ دسمبر ۱۹۶۰ء کو وفات پائی اور ۱۹۰۱ء سے پہلے کی بیعت کی وجہ سے صحابہ خاص کے قطعہ نمبر ۴ میں سپرد خاک کئے گئے۔

اے خدا بر تربت او بارش رحمت ببار

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا کرم الٰہی صاحبؓ

روحانی جماعتوں میں جہاں ہر قسم کی قربانیاں پیش کرنے والے لوگ ہوتے ہیں، و... مخلصین کا ایک طبقہ ایسا بھی ہوتا ہے جو گو اپنے اخلاص و ایثار کے اعتبار سے بہت ارفع مقا... پر فائز ہوتا ہے۔ لیکن اپنے وسائل کی کمی کی وجہ سے وہ مالی یا جانی قربانی پیش کرنے کے قابل ...ں ہوتا۔ تاہم اُسے ایک اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ ایک ایسے طریق سے جماع... کی خدمت کرتا ہے جو روحانی اعتبار سے مالی اور جانی قربانیوں سے بھی زیادہ کارگر اور تیر بہ... ہوتا ہے۔ اور وہ طریق ہے...... دعا...... سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العز... نے تحریک جدید کے مطالبات میں ایک مطالبہ دعا کا بھی فرمایا ہے جو ایسے ہی لوگوں کے ل... ہے۔

ایسے ہی دعا گو مخلصین میں ہمارے ایک بزرگ صحابی درویش حضرت بابا کرم الٰہی صاحبؓ تھے۔ جو ان پڑھ بھی تھے اور معمر بھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں توفیق بخشی تھی کہ وہ نمازوں کے علاوہ تہجد کے بھی پابند تھے۔ ان کا یہ معمول تھا کہ سب سے پہلے مسجد میں پہنچتے اور سب سے آخر میں واپس آتے اور مسجد کی فضا کو دعاؤں سے معمور کر دیتے۔

وفات سے قریباً" پانچ سال قبل آپ کو موتیا بند ہو گیا تھا جو باوجود علاج اور اپریشن کے دور نہ ہوا اور آپ کی بینائی جاتی رہی۔ تاہم وہ ایک اندازے اور دیواروں کے سہارے سے باقاعدہ مسجد میں پہنچتے رہے۔ اور کسی دوست کو ساتھ لے کر دعا کے لئے بہشتی مقبرہ بھی چلے جاتے تا آنکہ کمزوری نے معذور بنا دیا۔ آخر ۹۲ سال کی طویل طبعی عمر پا کر ۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کو وفات پا کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔ آپ کو قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں سپرد خدا کیا گیا۔

آپ کا اصل وطن بھڈیار ضلع سیالکوٹ تھا اور مئی ۱۹۴۸ء میں خدمت مرکز کے لئے قادیان تشریف لائے تھے۔ نہایت حلیم اور غریب الطبع اور سادہ دیہاتی وضع قطع کے بزرگ تھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اپنا قرب بخشے۔ آمین۔

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت حاجی ممتاز علی صاحبؓ

حضرت حاجی ممتاز علی صاحبؓ درویش صحابی ابن صحابی تھے۔ ریاست رام پور (یو۔ پی) کا مشہور خاندان جو "علی برادران" کے نام سے معروف ہے، آپ انہی میں سے ایک کے فرزند اکبر تھے۔ مولانا محمد علی شوکت علی جنہیں بھارت کی سیاست اور جنگ آزادی میں ایک امتیازی مقام حاصل ہوا۔ ان کے بڑے بھائی مولانا ذوالفقار علی خاں صاحب گوہر سیاسی لائن میں پڑنے کی بجائے علم و دین کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مامور زمانہ کی شناخت کی توفیق بخشی۔ اور آپ نے دینی اور دنیوی نعمتوں سے وافر حصہ پایا حاجی ممتاز علی صاحب انہی کے فرزند تھے۔ مدرسہ احمدیہ کے تعلیم یافتہ تھے۔ اور بیرونی ممالک میں کچھ عرصہ بطور مبلغ بھی کام کرتے رہے۔ لیکن چونکہ دمہ کا مستقل عارضہ لاحق تھا اور صحت کمزور تھی اس لئے تبلیغی خدمات جاری نہ رکھ سکے۔

تقسیم ملک کے بعد خدمت مرکز کے جذبہ سے یہیں ٹھہر گئے تھے۔ اور اپنی ہمت واستطاعت کے مطابق خدمات بجا لاتے رہے۔ بڑے سنجیدہ۔ خاموش طبع اور تعاون کرنے والے آدمی تھے۔ کوئی کام ان کے سپرد کیا جاتا وہ اسے خوشی اور خلوص سے سرانجام دیتے تھے۔

آخری ایام میں دمہ کے علاوہ انہیں دق کا مہلک عارضہ بھی لاحق ہو گیا تھا۔ صحت پہلے ہی کمزور تھی اس لئے جسم میں قوت مدافعت نہ رہی۔ اور ۱۹ جولائی ۱۹۵۴ء کو قریباً" ساٹھ سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم کے چھوٹے بھائی میاں محمد عبداللہ صاحب بھی قادیان میں مقیم ہیں جو تقسیم ملک سے بہت عرصہ قبل سے دماغی عارضہ میں مبتلا ہیں۔ ویسے تعلیم یافتہ ہیں۔ اور اگر دماغی عارضہ لاحق نہ ہو جاتا تو کام کے آدمی تھے۔

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت میاں محمد عبداللہ صاحب افغانؓ

افغانستان کی سنگلاخ سرزمین نے اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں بہت تھوڑا حصہ ڈالا۔ لیکن حق یہ ہے کہ وہ تھوڑا ہو کر بھی بڑا عظیم الشان تھا۔ حضرت صاحبزادہ سید عبداللطیف صاحب شہید رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قربانی ہی اتنی بڑی قربانی تھی کہ اپنے خون سے تاریخ احمدیت کو سرخرو اور مزیّن کر گئی۔

اسی زمانے میں جو پروانے شمع احمدیت پر نثار ہو کر یہاں پہنچے۔ انہی میں حضرت میاں محمد عبداللہ صاحب صحابی حضرت مسیح موعودؑ بھی تھے۔ آپؓ کا علم تو کم تھا لیکن نور ایمان سے وافر حصہ پایا تھا۔ اور نور نبوت سے براہ راست اکتساب نے اس نور ایمان کو اور بھی جلا بخش دی تھی۔ آپؓ نے اپنی ساری زندگی بڑے صدق و خلوص سے گزاری۔ پہلے آپ سیدنا حضرت امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ پہرہ دار کے طور پر خدمات بجالاتے رہے۔ اور پھر خزانہ صدر انجمن احمدیہ کے پہرہ دار رہے۔ چنانچہ تقسیم ملک کے وقت بھی آپ خزانہ کے پہرہ دار ہی تھے۔ اور زمانہ درویشی میں بھی اسی خدمت پر مامور رہے۔

نہایت مخلص، خاموش طبع اور اپنے کام سے کام رکھنے والے بزرگ تھے آپ حضرت مولوی عبدالستار صاحب عرف ''بزرگ صاحب'' کے بھتیجے تھے۔ آپ کے والد صاحب کا نام عبدالغفار تھا اور وطن خوست علاقہ کابل تھا۔

ابتدائے ۱۹۵۲ء میں بیمار ہو گئے اور بیماری طول پکڑ گئی۔ کافی علاج معالجہ قادیان میں بھی ہوتا رہا اور پھر دھاریوال کے ہسپتال میں بھی داخل کروایا گیا۔ بعض درویش بھائیوں نے اپنا خون بھی دیا۔ لیکن وقت پورا ہو چکا تھا۔ اس لئے ۲۶ اپریل ۱۹۵۴ء کو آپؓ نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا بھاگ صاحبؓ امرتسری

حضرت بابا بھاگ صاحب امرتسریؓ ولد جیوا صاحب سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی تھے۔ اور لمبے عرصہ سے قادیان میں رہتے تھے۔ یہاں وہ کڑھائی اور زردوزی کا کام کرتے تھے۔ اور یہی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ ان کی دو بیٹیوں کی شادیاں بھی قادیان میں ہوئی تھیں۔ ایک داماد میاں عبداللہ صاحب مالی تھے۔ آپ تقسیم ملک کے وقت ہی کافی معمر تھے۔ اور تقسیم کے بعد تو پیر فرتوت ہو گئے تھے۔ خاموشی، تنہائی اور دعاؤں سے ہی درویشانہ خدمت بجا لاتے رہے۔ عمر کے آخری ایام میں چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے تھے۔ آخر ۱۸ جون ۱۹۵۶ء کو موت کا پیغام آ گیا اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے اللہ تعالیٰ آپ کے درجات میں بلندی بخشے۔ آمین

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا شیر محمد صاحب

حضرت بابا شیر محمد صاحب ولد دتہ خان صاحب بھی سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی تھے۔ اور قادیان کے محلّہ دارالعلوم میں ان کا اپنا مکان تھا۔ تقسیم ملک کے وقت پاکستان چلے گئے تھے۔ لیکن حضور انور کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے مئی ۱۹۴۸ء میں قادیان تشریف لائے۔ اس وقت آپ کی عمر ۹۸ سال کی تھی۔ کافی معمر ہونے کے باوجود نمازوں کے لئے باقاعدہ مسجد میں تشریف لاتے۔ قد لمبا اور دیہاتی سادگی کا مجسمہ تھے۔ سو سال کی عمر میں ۱۷ اگست ۱۹۴۹ء کو وفات پائی۔ اور قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں سپرد خدا کئے گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت حافظ صدر الدین صاحبؓ

حضرت حافظ صدر الدین صاحبؓ جو علی چک ضلع گجرات کے رہنے والے تھے۔ اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی تھے، سیدنا حضرت اقدس امیر المومنین خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ کی تحریک پر ۱۱ مئی ۴۸ء کو قادیان تشریف لائے۔ اور صرف دس سال درویشی کی خدمت بجالا کر ۳/۴/۵۸ کو ۹۲ سال کی عمر میں وفات پا کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔

مرحوم قرآن کریم کے حافظ تھے۔ اور درویشی کے ایام میں بچوں کو قرآن کریم پڑھاتے رہے۔ چونکہ پیر فرتوت تھے اسلئے بعض گھروں میں ان کا آنا جانا تھا۔ بزرگ اور دعا گو آدمی تھے۔ اور بعض درویش ان کی خدمت کرتے رہتے تھے۔ آپ کا قد چھوٹا تھا۔ رنگ گورا اور نقوش باریک تھے۔ لمبی داڑھی تھی اور عام طور پر سبز رنگ کے کپڑے پہنتے۔ بالخصوص قمیص کہ وہ چولے کی قسم کی ہوتی تھی۔

مرحوم کے تعلقات راقم کے خاندان سے گہرے تھے۔ راقم کے والد حافظ غلام غوث صاحب اور مرحوم نے اکٹھے ایک ہی درس گاہ میں قرآن کریم حفظ کیا تھا۔ اس تعلق سے ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ جس درس گاہ میں انہوں نے قرآن کریم حفظ کیا۔ وہ جنڈ شریف ضلع گجرات میں ہے اور راقم کے حقیقی پھوپھا حافظ علم الدین صاحب درس دیتے تھے۔ اور یہ اتنی بڑی درس گاہ تھی کہ بیک وقت سینکڑوں لوگ قرآن کریم حفظ کرتے تھے۔ اور ہزاروں ہزار آدمیوں نے اس درس گاہ میں قرآن کریم حفظ کیا۔

للہ شریف ضلع جہلم کے ایک صاحب حافظ قاری غلام نبی صاحب تھے جو راقم کے دوست اور بزرگ تھے۔ انہوں نے ایک مرتبہ بتایا کہ جنڈ شریف کی درسگاہ میں کوئی خاص ریکارڈ تو نہیں رکھا جا سکتا تھا البتہ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ صرف علم الدین نام کے جن لوگوں نے قرآن کریم حفظ کیا ان کی تعداد ۱۴۰۰ تھی۔ اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کس قدر لوگوں نے وہاں قرآن کریم حفظ کیا ہوگا۔

میں جو کچھ یہاں عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ حافظ قاری غلام نبی صاحب آف للہ شریف نے مجھے ایک بار بتایا کہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دعویٰ ماموریت کے بعد جب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی نے ہندوستان بھر میں پھر کر علما، گدی نشینوں اور دوسرے مشاہیر سے کفر کے فتویٰ پر دستخط حاصل کئے تو جنڈ شریف میں حافظ علم الدین صاحب کے پاس بھی پہنچے اور فتویٰ پیش کر کے دستخط کرنے کے لئے کہا۔ حافظ علم الدین صاحب چونکہ درویش قسم کے بزرگ تھے اور ہر وقت چادر کے پلو سے اپنے چہرے کو یوں چھپائے رکھتے تھے کہ صرف ڈاڑھی نظر آتی تھی۔ انہوں نے جب مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی کا تیار کردہ فتویٰ سنا تو کہا:۔

''مولوی صاحب! مجھے تو اپنے ایمان اور انجام کا بھی علم نہیں ہے۔ میں کسی کو کافر قرار دینے کے فتویٰ پر دستخط کیوں کر کروں۔''

چنانچہ انہوں نے دستخط نہ کئے اور مولوی محمد حسین صاحب بٹالوی واپس چلے آئے۔

میں نے اوپر جن لوگوں کا ذکر کیا ہے افسوس کہ ان میں سے کسی کو احمدیت قبول کرنے کی توفیق نہ ہوئی۔ یعنی میرے پھوپھا حافظ قاری علم الدین صاحب، میرے والد صاحب حافظ غلام غوث صاحب اور حافظ قاری غلام نبی صاحب۔ لیکن میں نے یہ عجیب بات دیکھی ہے کہ اس درس گاہ سے نکلے ہوئے اکثر لوگ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی شان میں گستاخی ہرگز نہ کرتے تھے۔

اسی سلسلہ میں ایک اور انکشاف بڑا عجیب ہے۔ میں اسی سال پاکستان گیا تو حافظ علم الدین صاحب موصوف کے پوتے حافظ عبدالرحمٰن صاحب (جو احمدیت کے سخت مخالف ہیں) جنڈ شریف سے مجھے ملنے آئے اور انہوں نے ذکر کیا کہ تقسیم ملک سے قبل میں ایک بار قادیان گیا تھا۔ تا کہ ان انتقالات کی نقول حاصل کروں جو بانی جماعت احمدیہ کی وفات کے بعد ان کی جائداد کی تقسیم سے متعلق تھیں۔ اور گورداسپور سے ایسی نقول حاصل بھی کی گئیں۔

مجھے ان سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ وہ نقول کیوں حاصل کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ میں سمجھ گیا تھا کہ وہ یہ پروپیگنڈا کرنا چاہتے تھے کہ بانی جماعت احمدیہ کی جائداد شرعی طور پر تقسیم نہیں ہوئی۔ چنانچہ میں نے پوچھا کہ نقول حاصل کر کے آپ نے کیا کیا؟ تو وہ کہنے

لگے کہ "بس یونہی"، یعنی چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی جائداد شرعی طور پر تقسیم ہوئی تھی۔ اس لئے ان لوگوں کی محنت اکارت گئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ احمدیت کے مخالفین کن کن راہوں سے احمدیت کی مخالفت کے حربے تلاش کرنے نکلتے ہیں۔ ختم اللہ علی قلوبھم......

مجھے اس سے یہ بتانا بھی مقصود ہے کہ دادے کا رنگ کیا تھا اور پوتے کا رنگ کیا ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ مقلب القلوب ہے۔ دعا ہے کہ وہ ان لوگوں کی آنکھیں کھول دے۔

(بدر ۲۷ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا عبدالسبحان صاحبؓ

ہمارے ایک اور بزرگ اور صحابی مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت بابا عبدالسبحان صاحبؓ تھے۔ بڑھاپا تقسیم ملک سے قبل ہی سے جن کا پیچھا کر رہا تھا اور جن پر بڑھاپے کے آثار اتنے ہویدا اور کمر اتنی خمیدہ تھی کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ چلتے چلتے اس مقدس بستی کی سرزمین میں اپنی قبر کی جگہ تلاش فرما رہے ہیں۔ عمر کا ہر سال چہرے پر اپنی منزلوں کا نشان چھوڑ گیا تھا۔ مگر آفرین ہے اس بزرگ پر کہ وہ نہ صرف پورا وقت محنت کا کام کرتے تھے بلکہ بازار سے اپنا سودا سلف بھی خود ہی جا کر لاتے تھے۔ چونکہ کشمیری النسل تھے اس لئے ایک مخصوص طرز کا لمبا سا چوغہ پہنتے تھے۔ جب تک چلتے پھرتے رہے وسمہ اور مہندی بھی لگاتے رہے۔ اپنی عمر کے آخری تین سال وہ چلنے پھرنے سے بالکل معذور ہو گئے تھے۔ اور ہر وقت بیٹھے رہتے تھے۔ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مامور زمانہ کی صحبت اُٹھائی ہو اور اس کے آثار معذوری کے باوجود نظر نہ آئیں۔ ہر وقت قرآن کریم کی تلاوت کرتے تھے شنوائی بہت کم تھی اس لئے لکھ کر بات سمجھانا پڑتی تھی۔ اور زبانی جواب دیتے تھے۔ جہیر الصوت تھے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اشعار اور شرح القصیدہ اکثر اونچی آواز سے پڑھتے تھے۔ آپ معمولی معماری کا کام اور چونا قلعی کا کام جانتے تھے۔ آپ کا قد درمیانہ۔ رنگ سفید اور نقوش باریک تھے۔ متواتر تین سال تک بیٹھے رہنے کی وجہ سے ٹانگیں جڑ گئی تھیں۔ جو وفات کے بعد بھی کھل نہ سکیں۔ یہ حضرت مسیح موعود علیہ

السلام کے صحابی ہونے کی وجہ سے اس گلدستہ کا ایک خوش رنگ پھول تھا۔ جسے وقت کی آندھی نے توڑ کر ہم سے جدا کر دیا۔ اور وہ اپنے آقا کے قرب میں بہشتی مقبرہ میں پہنچ گیا۔ اور بہشتی مقبرہ میں قدم رکھتے ہی جس نے یقیناً کہا ہوگا۔ فزت واللہ!۔ مرحوم موصی تھے اور تحریک جدید کے دور دوم کے مجاہد تھے۔

(بدر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا شیخ احمد صاحب صحابیؓ

حضرت بابا شیخ احمد صاحب ولد قاری غلام حُم صاحب قوم موہیال دت محلہ مسجد مبارک قادیان کے رہنے والے تھے۔ تقسیم ملک سے قبل معمولی دکانداری کا کام کرتے تھے تقسیم کے بعد خدمت قادیان کے جذبہ سے یہیں ٹھہر گئے۔ اور اپنے مکان میں ہی سکونت پذیر رہے۔ کم گو بھی تھے اور کم آمیز بھی تھے۔ تنہائی پسندی کی وجہ سے مجالس میں جانا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اپنی ساری درویشی کا زمانہ اسی طرح تنہائی میں گزار دیا۔ چونکہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی ہونے کا شرف حاصل تھا اس لئے درویش اُن کا احترام کرتے تھے۔ سفید ریش اور کوتاہ قامت تھے۔ درویشی کے گیارہ سال عزلت نشینی میں گزار کر ۱۰ فروری ۱۹۵۸ء کو وفات پائی۔ اور قطعہ صحابہ نمبر ۸ بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔ آمین۔

(بدر ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء)

حضرت بابا اللہ بخش صاحب صحابیؓ

وہ خوش قسمت انسان یقیناً قابل صدر شک ہے جسے مسیح دوراں کے در پر کافی عرصہ تک دربانی کا شرف حاصل رہا۔ حضرت مسیح الزمان کی صحبت اور پھر آپؑ کے در کی دربانی۔ سبحان اللہ۔ وہ لوگ جنہوں نے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی صحبت سے براہ راست فیض حاصل کیا، اُن سب کی زندگیاں ہمارے لئے مشعل راہ بھی ہیں

اور قابل رشک بھی۔ اور انہیں یہ شان حاصل ہے کہ وہ زندگی کی تیرہ و تار راتوں میں جھلملاتے ہوئے روشن ستارے ہیں۔ اور جو ہر گم کردہ راہ کو اپنے عمل و کردار اور خاموشی و گفتار سے رہنمایاں بخشتے ہیں۔

انہی قابل احترام ہستیوں میں سے ہمارے ایک بزرگ درویش حضرت بابا اللہ بخش صاحب صحابیؓ تھے۔ جنہوں نے تقسیم ملک کے بعد اپنی بڑھاپے کی زندگی کے سترہ طویل سال نہایت خاموشی اور صبر و سکون کے ساتھ گزارے۔ سترہ سال کا زمانہ کسی کے اخلاق و عادات کو ناپنے اور جانچنے کا ایک طویل زمانہ ہے۔ اور ان طویل سترہ سال کا ایک ایک دن شاہد ہے کہ حضرت بابا صاحب نہایت شریف النفس۔ کم گو اور عابد و زاہد بزرگ تھے۔

اپنی جوانی کے ایام میں حضرت بابا جی کو سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی ڈیوڑھی میں دربانی کا شرف کئی سال تک حاصل رہا۔ اور اس کے بعد بابا جی حضرت نواب محمد علی خاں صاحبؓ کے خانگی ملازموں میں شامل ہو گئے۔ یہ سونے پر سہاگہ تھا۔ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے فیض صحبت سے فیض یاب ہونے کے بعد حضور علیہ السلام کے قابل صد احترام داماد اور حضورؑ کی عالی مرتبت صاحبزادی حضرت نواب مبارکہ بیگم صاحبہ کی خدمت کا شرف جسے حاصل ہوا ہو اس کی قسمت پر جتنا ناز اور رشک کیا جائے کم ہے۔

حضرت بابا جی نہایت متوکل۔ سادہ طبع اور عبادت گزار انسان تھے اور انہیں دیکھ کر عبودیت کا مفہوم ذہن نشین کرنا آسان ہو جاتا تھا۔ بابا جی چونکہ خاکسار کے دفتر میں دفتری کی خدمت بجالاتے تھے۔ اس لئے خاکسار جب کبھی سفر یا دورہ پر قادیان سے باہر جاتا تو ان سے درخواست کرتا تھا کہ وہ میرے گھر میں سویا کریں۔ میرے گھر والوں کا بیان ہے کہ بابا جی نصف شب کے بعد کبھی نہ سوتے تھے۔ اور آدھی رات ہوتے ہی وضو کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور سر بسجود ہو جاتے۔ اور نوافل اور دعاؤں میں مشغول رہتے۔ لوٹا وضو اور نوافل گویا اُن کی زندگی کے اجزاء تھے۔

حضرت بابا جی کے اکلوتے فرزند میاں علم الدین صاحب احمد نگر (نزد ربوہ) میں رہتے ہیں۔ بابا جی جب گذشتہ سال بیمار ہوئے تو ان کی انتہائی خواہش تھی کہ آخری وقت میں بیٹے سے

ملاقات ہو جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ خواہش پوری فرما دی اور میاں علم الدین صاحب پاسپورٹ لیکر قادیان پہنچ گئے۔ اور اپنے بوڑھے باپ کی خدمت کا شرف پاتے رہے۔

حضرت بابا جی قادیان سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع گاؤں ہرچووال کے رہنے والے تھے اور پیشہ کے لحاظ سے جفت سازی کرتے تھے۔

(بدر ۲۹ جولائی ۱۹۶۵ء)

حضرت بابا غلام محمد صاحب صحابیؓ

۲۰/۴/۶۷ کو ہمارے ایک بزرگ درویش بھائی حضرت بابا غلام محمد صاحب صحابی کی فصل زندگی پک کر تیار ہو گئی۔ اور کارکنان قضا و قدر اسے سمیٹ کر لے گئے۔ بابا جی موضع مانگا ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے تھے لیکن ابتدائے درویشی سے ہی خدمت مرکز کے لئے یہاں مقیم تھے۔ پرانی وضع کے سادہ طبع بزرگ تھے۔ منحنی سا قد و قامت تھا۔ اور سرما ہو یا گرما سفید لباس میں ملبوس رہتے تھے۔ بڑھاپے کی وجہ سے بہشتی مقبرہ وغیرہ مقدس مقامات پر صرف بیٹھ کر پہرہ کی ڈیوٹی دیا کرتے تھے۔ مگر آخری چند سالوں میں جب ضعف پیری نے معذور کر دیا تو دوسری تمام ڈیوٹیوں سے فارغ ہو کر صرف بہشتی مقبرہ میں چارپائی بچھا کر پہرہ دیتے رہے۔ غیر مسلم زائرین اکثر بہشتی مقبرہ کی زیارت کے لئے آتے ہیں، اُنہیں بڑے شوق سے تبلیغ کیا کرتے تھے۔ گو بابا جی ان پڑھ تھے۔ مگر جماعتی مسائل سے واقفیت رکھتے تھے۔

آپ کا عرف بابا ''حویلی'' تھا۔ اس تسمیہ کی وجہ یہ ہوئی کہ زندگی بھر مجرد رہے۔ اور اپنے گاؤں میں ہمیشہ اپنی حویلی میں ہی حاضر رہتے تھے۔ اسی نسبت سے ''بابا حویلی'' نام پڑ گیا تھا۔

آپ نے ۱۹۰۲ء میں سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے دست مبارک پر بیعت کا شرف حاصل کیا تھا۔ موصی بھی تھے ۲۰-۴-۶۷ کو ۸۷ سال کی عمر پا کر فوت ہوئے اور قطعہ صحابہ ۸ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔

(بدر ۸ جون ۱۹۶۷ء)

حضرت بابا محمد خاں صاحب رضؓ عرف بھمبوُ

ہر کسے راہ بہر کارے ساختند

حضرت بابا محمد احمد خان صاحب عرف بھمبو خاں صاحب ولد غلام حسین صاحب سڑوعہ ضلع ہوشیار پور کے رہنے والے تھے۔ اور تقسیم ملک سے قبل دارالمسیح کے اندر سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے گھروں میں ایک ڈیوڑھی کے دربان تھے۔ بوڑھے مخلص اور غریب طبع درویش تھے۔ لیکن اس غربت پر ہزاروں امارتیں قربان ہوں جسے اس مقدس ڈیوڑھی کی دربانی نصیب ہوئی۔ اور شاید یہی خدمت تھی جس نے حضرت بابا کو صحابیت کے شرف کے ساتھ ہی درویشی کی سعادت بھی عطا فرمائی۔ اور آپ تقسیم ملک کے بعد بھی یہیں کے ہوگئے۔ چونکہ پرانے بزرگ تھے اور پرانے لوگوں کا یہ وطیرہ ہمیشہ رہا ہے کہ وہ نچلے نہیں بیٹھتے تھے۔ چنانچہ بابا جی نے مسجد مبارک کے گیٹ کے سامنے درزی خانے والی دکان میں بیسن کی مٹھائیاں بنا کر بیچنا شروع کیا۔ اور اسی پر گزارہ تھا۔ بہت دعا گو بزرگ تھے۔ ۲۰ جولائی ۱۹۵۰ء کو ۷۸ سال کی طویل عمر پا کر داعی اجل کو لبیک کہا۔ اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ ۸ میں سپرد خدا کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ آپ کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین۔

(بدر یکم نومبر ۱۹۶۲ء)

محترم شیخ محمد یعقوب صاحب چنیوٹی!

۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کو رتن باغ لاہور سے قادیان آنے والے قافلہ میں متدین، متشرع اور بزرگ صورت و سیرت کا ایک شخص ۳۱۳ درویشوں کے مبارک عدد میں معدود ہونے کے لئے یہاں پہنچا۔ میری اس سے کوئی جان پہچان نہ تھی۔ لیکن راستہ میں میں نے اسے کئی بار دیکھا۔ اور دیکھنے کی خواہش کے ساتھ دیکھا۔ اس کے لب ہلتے تھے اور اس کی پیشانی سے لمعات نور نکل نکل کر نظروں سے اتر کر دل میں کھب جاتے تھے۔ ''خدا جانے یہ کون نیک سیرت انسان

ہے۔'' میرے دل نے کئی بار مجھ سے سوال کیا۔ لیکن میں اسے صرف اتنا ہی بتا سکا کہ یہ ایک درویش ہے جو اپنے عزیزوں اور جگر گوشوں اور دنیاداری کو خدا کی خاطر خیر باد کہہ کر جا رہا ہے...... جا رہا ہے قادیان کی مقدس بستی کے ایک الگ تھلگ اور محصور سے گوشے میں۔ اس گوشے میں جو اس وقت ویران سا ہے۔ ایسا ویران جس کی ویرانی پر لاکھوں آبادیاں تصدّق......!!

وہ نیک نفس انسان قادیان پہنچ کر دارالمسیح کے اندر ایک مقدس مکان میں مقیم ہو گیا۔ ایک لمبے عرصہ تک اسی مکان میں اس کی رہائش رہی۔ یہ وہ بالا خانہ ہے جو سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی کا مملوکہ ہے اور حضرت ام طاہر کے مکان کی طرف سے سیڑھیاں اس پر جاتی ہیں۔ شروع ایام میں جب علاقہ حیدر آباد دکن کے چند بچے تعلیم حاصل کرنے کے لئے قادیان آئے تو وہ بھی اسی مکان میں رہے۔ اور اسے بورڈنگ کا نام دیا گیا۔ اور شیخ صاحب مرحوم اس بورڈنگ کے ٹیوٹر مقرر ہوئے۔ مرحوم بڑی محنت سے بچوں کی دیکھ بھال کرتے اور انہیں پڑھاتے تھے۔ لیکن دقت یہ پیش آگئی کہ کہاں ایک خاموش اور نرم طبع اور ہر وقت ذکر الٰہی میں غرق رہنے والا ٹیوٹر اور کہاں سکول کے شوخ اور چنچل لڑکے۔ کوئی مناسبت نہ تھی۔ آخر اُن کی اپنی خواہش پر انہیں اس ڈیوٹی سے فارغ کر دیا گیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد مرحوم حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے اُس چھوٹے کمرے میں آگئے جو بیت الدعا والے دالان کے سامنے ہے۔ اور مسجد مبارک سے ملحق ہے۔ یہ مقدس اور تاریخی کمرہ جس کے ایک طرف مسجد مبارک ہے دوسری طرف بیت الدعا۔ اور حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ کے مکانات۔ تیسری طرف حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی پیدائش مبارک والا کمرہ۔ اور چوتھی طرف بیت الریاضت۔ وہ بیت الدعا جس میں اس زمانہ کے مامور و مرسل من اللہ نے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے دعاؤں کے عین نشانہ پر بیٹھنے والے تیر چھوڑے تھے۔ وہ بیت الریاضت جہاں امام آخرالزمان نے مسلسل چھ ماہ کے روزے رکھ کر اسلام کی ڈوبتی ہوئی نیا کو بچانے کے لئے ہر ہر نفس کے ساتھ خدا کو پکارا تھا۔ اور جس کے کچے فرش پر بیٹھ کر خاتم العشاق محمدؐ نے براہین احمدیہ جیسا اسلامی بم تیار کیا تھا جس نے ایوان کفر کو ریزہ ریزہ کر کے رکھ دیا۔

یہ ماحول تھا جس میں مرحوم شیخ محمد یعقوب صاحب مقیم تھے۔ یہ تقدس مآب فضا تھی جس

میں مرحوم نے درویشی کا اکثر حصہ گزارا۔اوراس طرح گزارا کہ ایک قابل صدرشک جینا جیا۔یہ شخص تھا جسے دیکھ کر ذکر الٰہی کا مفہوم پوری طرح ذہن میں سما جاتا تھا۔بلکہ یوں جی چاہتا تھا کہ اس کا نام بدل کر شیخ محمد یعقوب کی بجائے ''ذکر الٰہی'' رکھ دیا جائے۔تہجد کے اولین لمحات میں وہ شخص چار پائی کو چھوڑ کر مسجد مبارک میں پہنچ جاتا تھا۔اور صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اسی چار پائی پر آکر بیٹھ جاتا تھا۔ایک لے اور ترتیل اور سوز کے ساتھ قرآن کریم کی تلاوت اس طرح کرتا تھا کہ یوں معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پپوٹوں نے آنسوؤں کا ایک سیلاب روک رکھا ہے اس کے چہرے پر رقت کا تصرف ہوتا تھا اور نوک مژگان پر نم کی جھلک نمایاں ہوتی تھی۔معصومیت اور فرشتگی کا ایک ہالہ سا اس کے بشرے کو گھیرے رہتا تھا۔

کبھی کبھی وہ تلاوت قرآن کریم سے فارغ ہو کر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اشعار پڑھتا تھا۔ایک گنگناہٹ اور نغمگی اور آہستگی کے ساتھ۔جیسے بچے اپنا منظوم سبق اپنے گھروں میں اپنے والدین کو خوش کرنے کے لئے ترنم اور کیف کے ساتھ جھوم جھوم کر یاد کرتے ہیں۔محترم سید محمد شریف صاحب درویش جو مرحوم کے ہمسائے میں رہتے تھے، کہتے ہیں کہ اُن کی لے میں ایک عجیب روحانی کشش ہوتی تھی۔اور یوں جی چاہتا تھا کہ چھپ کر ان اشعار کو سنا جائے اور اس سوز کو اپنے اندر جذب کر لیا جائے۔چھپ کر اس لئے کہ کہیں آگاہ ہونے پر کہ کوئی سن رہا ہے معصومیت کے اس آئینے میں بال نہ آجائے!

مجھے اس لمبے عرصہ میں سینکڑوں بار محترم صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کی خدمت میں حاضر ہونے کے لئے ادھر جانے کا اتفاق ہوا۔ایک مرتبہ بھی میں نے نہ دیکھا کہ شیخ صاحب مرحوم ذکر الٰہی کے بغیر بیٹھے ہوں۔چار پائی پر کبھی اکڑوں اور کبھی آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔سامنے تکیہ رکھا ہے۔تکیے پر قرآن کریم کھلا رکھا ہے اور تلاوت ہو رہی ہے۔پھر یہ بات بھی نہیں کہ محترم صاحبزادہ صاحب موصوف کی خدمت میں حاضر ہونے کا میرا کوئی خاص وقت مقرر تھا۔کئی بار صبح سویرے جانا پڑا۔کئی بار دوپہر کو اور کئی بار ظہر یا عصر کے بعد مگر میں نے ہر بار یہی دیکھا کہ شیخ صاحب تلاوت یا ذکر میں مشغول ہی نہیں بلکہ محو ہیں۔بلکہ مدغم ہیں۔بلکہ یک جان ہو گئے ہیں۔اس طرح کہ ''من تو شدم تو من شدی'' کا سا معاملہ ہے۔

مرحوم کو اللہ تعالیٰ نے ان مقدس مقامات میں درویش ہونے کی حالت میں رہنے کی توفیق اور اعزاز بخشا۔لیکن حق یہ ہے کہ مرحوم نے وہاں رہنے کا حق ادا کر دیا۔اور ان مقامات کی تقدیس کو اُس نے اپنے اندر جذب کرنے کی اپنی سی پوری کوشش کی۔اس نے اپنی درویشی بھر کی راتیں جاگ کر یاد الٰہی میں گزاریں اور دن یاد الٰہی میں بسر کئے اور ہم سب درویشوں کے لئے ایک نیک اور پاک نمونہ اور قابل رشک زندگی کی یاد چھوڑ گیا۔

اذان سن کر تو ہر مومن مسجد میں جانے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور یہی مومنانہ شان ہے ۔لیکن مرحوم کو اذان کا انتظار نہیں ہوتا تھا بلکہ وہ اذان سے پہلے ہی مسجد مبارک میں جا کر بالعموم مسجد کے پرانے حصے میں دوزانو بیٹھ جاتا تھا۔اور بڑی خاموشی اور متانت کے ساتھ ذکر الٰہی میں مشغول ہو جاتا تھا۔اور کئی بار ایسا بھی ہوا کہ ایک نماز پڑھ کر وہیں بیٹھ گیا اور پھر دوسری نماز پڑھ کر واپس کمرے میں آیا۔مرحوم کا مسجد میں بیٹھنا بھی بڑا پر وقار ہوتا تھا۔اول تو وہ کسی سے بولتا ہی نہ تھا۔لیکن اگر ضرورت پیش آجاتی تو بڑی آہستگی سے اور سرگوشی کے سے انداز میں بولتا تھا۔شاید مرحوم کو یہ احترام ملحوظ رہا ہو کہ ان مقدس مقامات میں خدا کے ایک نبی کی آوازیں بلند ہو چکی ہیں۔ایسا نہ ہو کہ بلند آواز میں بات کرنے سے اس کی آواز زیادہ بلند ہو جائے اور فضاؤں میں بکھری ہوئی نبی کی آوازوں سے اونچی ہو جائے......!

مرحوم نے اپنی ساری درویشی بڑی سادگی اور بڑے صبر و رضا کے ساتھ گذاری مرحوم کو دیکھ کر کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ وہ اچھے کھاتے پیتے خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ایک سادہ سی دھوتی۔سادہ سی قمیض اور سادہ سی ٹوپی۔اور دیسی جوتا۔یہی مرحوم کا لباس تھا۔مرحوم سالن اپنے ہاتھ سے پکاتے تھے اور روٹی لنگر سے لاتے تھے مگر روٹی کی قیمت ادا کرتے تھے۔مرحوم نے صدر انجمن احمدیہ سے ابتدائی دو تین سالوں میں وظیفہ لیا۔لیکن اس کے بعد کوئی وظیفہ نہیں لیا۔اور نہ صرف اپنا خرچ خود برداشت کرتے رہے بلکہ باقاعدہ چندہ ادا کرتے رہے۔اور تحریک جدید کے چندوں میں تو مرحوم کا نمونہ قادیان کے درویشوں کے لئے قابل تقلید تھا۔یعنی مرحوم اپنی زندگی میں ہی دفتر دوم کے بیس سالوں کا چندہ جمع کروا چکے تھے اس کے علاوہ مرحوم سلسلہ کی تمام تحریکات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

مرحوم ۵۹ء کے اوائل میں فالج کے مرض سے بیمار ہوئے۔احمدیہ شفاخانہ سے اور پھر امرتسر سے بھی علاج کروایا مگر افاقہ کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔آخر یہ خیال کر کے کہ شاید اپنے بچوں کے پاس پہنچ کر وہ بہتر رنگ میں علاج کرواسکیں گے اپنے لڑکے کے پاس ڈھاکہ چلے گئے۔لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ مرض کے علاج کے لئے نہیں بلکہ فرشتہ موت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ڈھاکہ جارہے ہیں۔

ڈھاکہ میں علاج ہوتا رہا۔اور مرض بڑھتا رہا۔اور قادیان کے درویشوں کو ان کے خطوط آتے رہے کہ میرے لئے شفایابی کی دعا کریں۔اور ساتھ ہی یہ کہ اللہ تعالیٰ مجھے جلد واپس قادیان لائے۔مگر اللہ تعالیٰ کی مشیت کچھ اور ہی تھی۔جو اس طرح پوری ہوئی کہ شیخ صاحب ڈھاکہ میں ۱۳جولائی ۶۰ء کو وفات پاگئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔مرحوم کی نعش کو ہوائی جہاز کے ذریعہ ڈھاکہ سے لاہور لے جایا گیا۔اور وہاں سے ٹرک میں ربوہ لے جایا گیا۔جہاں مرحوم کو بہشتی مقبرہ ربوہ میں سپرد خاک کردیا گیا۔

اور اس طرح ہمارا درویش بھائی ہم سے اگلی زندگی میں ملنے کے لئے عارضی طور پر جدا ہو گیا۔اللھم اغفرلہ وارحمہ۔اے ہمارے پیارے اور محترم بھائی! ہم تجھے خدا کے سپرد کرتے ہیں۔اشکبار آنکھوں کے ساتھ اور فگار دلوں کے ساتھ۔شاید مرتے وقت تجھے افسوس ہوگا کہ تجھے یہ موت قادیان میں کیوں نہ آئی۔ممکن ہے ربوہ کے بہشتی مقبرہ میں دفن ہوکر تو نے اس راز کو پالیا ہو۔لیکن جو حکمت اللہ تعالیٰ کی اس میں مجھے نظر آئی ہے وہ میں تجھے بتاتا ہوں۔وہ یہ ہے کہ تو نے اپنی درویشی کا بیشتر حصہ ایک نہایت مخلصانہ اور فقیرانہ رنگ میں پرسوز دعاؤں کے ساتھ حضرت ام المومنین رضی اللہ عنہا کے مکان میں گذارا ہے۔اور حضرت ام المومنین نے عالم ارواح میں تجھ پر خوش ہوکر تجھے اپنے قرب میں بلایا تھا۔اور تو وہاں پہونچ گیا۔

ہم سب درویش انشاء اللہ ہمیشہ تجھے یاد کریں گے۔اور تیرے لئے خدا سے مغفرت کے طالب ہوں گے۔ہم تیری نیم وا آنکھوں کا تصور کرکے غض بصر کا مفہوم سمجھا کریں گے۔اور چشم تصور میں تیرے لبوں کی ایک مسلسل اور متواتر حرکت دیکھ کر ذکر الٰہی کے مفہوم کو ذہن نشین کیا کریں گے۔اور عالم خواب میں تجھے اکڑوں بیٹھ کر ایک پرسوز لے کے ساتھ قرآن کریم پڑھتے

دیکھ کر انقطاع الی اللہ کی تفسیر ہمارے ذہنوں میں متبادر ہو جایا کرے گی۔حضرت ام المومنینؓ کا وہ حجرہ تجھے سلام کہتا ہے جس میں تو مقیم رہا۔بیت الریاضت تیرے لئے مغفرت کا طالب ہے جس کے قرب میں تو مجسم ذکر الٰہی بنا رہا۔اور بیت الدعا تیرے لئے دست بہ دعا ہے۔جس میں تو نے گداز دل کے ساتھ دعائیں کیں۔اور مسجد مبارک کا پرانا مقدس حصہ جس میں تو اپنے اوپر موت وارد کرکے بیٹھا کرتا تھا تیرے لئے برکت کی دعائیں کرتا ہے۔ان الفاظ میں کہ

مُبَارِکٌ مُبَارَکٌ وَّکُلُّ اَمْرٍ

مُبَارَکٍ یُجْعَلُ فِیْہِ

فی امان اللہ

(بدر ۱۸اگست ۱۹۶۰ء)

محترم شمس الدین صاحب معذور

جماعت احمدیہ اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے باوجود اور اپنی قلت تعداد اور کمی احوال کے باوجود آج اکناف عالم میں تبلیغ اسلام کا جو عظیم الشان کام سرانجام دے رہی ہے وہ حقیقتاً محیر العقول ہے۔اور بادی النظر میں ایک مخالف احمدیت یہی سوچتا ہے کہ اس جماعت کے پاس یا تو کوئی مخفی خزانے ہیں اور یا پھر اسے کسی حکومت کی طرف سے کوئی امداد ملتی ہے۔اور اگر یہ بھی نہیں تو اس جماعت کے پاس جادوگر ہیں جو بزور سحر روپیہ پیدا کرتے ہیں۔اور اس کے مبلغین قادیان اور ربوہ سے اٹھتے ہیں اور بحری بری اور ہوائی سفروں پر ہزاروں روپیہ خرچ کرکے حدود ارضی اور آفاق کو جا چھوتے ہیں اور تبلیغ اسلام کا ایک ایسا غلغلہ برپا ہے کہ اپنے اور بیگانے اس کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں۔

لیکن اگر ایسا سوچنے والے لوگ اخلاق واعمال کی روشنی میں جماعت احمدیہ کا جائزہ لیں۔اور ان کے نقطہ نظر میں کوئی ٹیڑھا پن نہ ہو تو انہیں اس جماعت میں ایسے ایسے لوگ نظر آئیں گے جو مضطرب ہوں گے اس بات کے لئے کہ کاش انہیں 1/3 سے بھی زیادہ بلکہ اپنی ساری جائداد جماعت کے سپرد کردینے کی اجازت قانوناً اور شرعاً حاصل ہوتی......!!

اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا کام کوئی مذاق نہ تھا۔ چودھویں صدی ہجری کا آغاز جہاں اہل اسلام کے اندرونی انتشار اور انحطاط کا زمانہ تھا وہاں اسلام کے مخالفین اپنی پوری پوری قوتوں کے ساتھ اس کے خلاف نبرد آزما تھے۔ اسلام ایک چراغ تھا جو مخالفت کے ان طوفانوں کے تھپیڑے برداشت کرتا ہوا برابر کچھ لو دیئے جا رہا تھا۔ اور یوں معلوم ہو رہا تھا کہ یہ بجھا ہی چاہتا ہے۔ لیکن وہ خدا جس نے اس کی نہ صرف حفاظت کا ذمہ لیا تھا بلکہ یہ بھی فرمایا تھا کہ ایک زمانہ میں اسلام پھر نقطہ عروج پر پہنچے گا۔ اس نے عین وقت پر انتظام فرمایا اور ایک مرد مجاہد ایک گمنام بستی سے اٹھ کھڑا ہوا اور ع

تم مسیحا بنو خدا کے لئے

کے پر خلوص نعروں نے اس کا استقبال کیا۔ تاریکی کے فرزند دور ہٹتے گئے اور روشنی اور نور کے رسیا قریب آتے گئے۔ اور انہوں نے اس مرد مجاہد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ عہد کیا کہ وہ اپنی جان، مال اور عزت سب کچھ دین اسلام کو سر بلند کرنے کے لئے آپ کے قدموں میں لا ڈالیں گے۔ یہ عہد کوئی مجذوب کی بڑ نہ تھی بلکہ اس کا عملی مظاہرہ ہوا کہ ابھی اس جماعت کے قیام پر ستر سال بھی نہیں گزرتے کہ قادیان اور ربوہ خواص اور عوام کے مراجع بن جاتے ہیں۔ ان دونوں چھوٹی چھوٹی بستیوں سے مبلغین کے قافلے نکل نکل کر دنیا کے کونوں تک پھیل جاتے ہیں۔ اب کون انصاف پسند کہہ سکتا ہے کہ وہ عہد جو چند مخلصین نے اس مرد مجاہد کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر کیا تھا وہ پورا نہیں ہوا......!!

''مجذوب کی بڑ'' ایک محاورہ ہے جو ایسے موقعوں پر بولا جاتا ہے۔ جب کوئی ایسی بات کہی جائے جس کے پورا ہونے کا قطعاً کوئی امکان نہ ہو۔ لیکن میں ایک ایسے مجذوب کی بڑ کا ذکر کرنے چلا ہوں جو واقعی پوری ہوئی۔ اور میں اس وقت جبکہ یہ سطور تحریر کر رہا ہوں بڑی مسرت اور بہجت کے ساتھ یہ محسوس کر رہا ہوں کہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی جو عظیم الشان عمارت جماعت احمدیہ کے ذریعہ زیر تکمیل ہے اس کی مستحکم بنیادوں میں ایک مجذوب کی مخلصانہ بڑ بھی شامل ہے۔ میں موصیوں کی پرانی مسلیں دیکھ رہا تھا ان میں وصیت نمبر ۱۴۱۳ کی ایک مسل شمس الدین صاحب معذور مجذوب کی ہے جو سنہ ۵۰ء میں فوت ہو چکے ہیں اور بہشتی مقبرہ میں مدفون ہیں۔ یہ

صاحب ۱۹۱۸ء سے قبل کے کسی سال میں کوہاٹ سے ہجرت کر کے قادیان آئے تھے۔ اور آخر دم تک قادیان میں رہے۔ اور درویشی کی سعادت پا کر سنہ ۵۰ء میں فوت ہوئے۔ یہ اپاہج تھے اور ایک چھوٹی سی کوٹھڑی میں جس کا طول و عرض تین تین فٹ سے زیادہ نہ تھا پڑے رہتے تھے۔

جب یہ اپاہج تھے تو ظاہر ہے کہ ان کا کوئی ذریعہ معاش نہ تھا۔ کسی نے دے دیا تو کھا لیا ورنہ صبر شکر کر کے پڑے رہے۔ لیکن قارئین کرام یہ پڑھ کر حیران ہوں گے کہ اس معذور احمدی نے اپنی ساری عمر معذوری کی حالت میں ۳x۳ فٹ کی کوٹھڑی میں گذار دی۔ اور جس کا کوئی ذریعہ آمد سوائے دست غیب کے نہ تھا۔ نہ صرف زندگی بھر چندہ دیا بلکہ ۱۹۹۰ء تک کا چندہ وصیت ادا کر دیا۔ اور یہ کوئی خیالی اور فرضی بات نہیں ہے بلکہ اس کی باقاعدہ رسیدیں مسل کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔

میں جب مسل کے اس حصے پر پہنچا جہاں رسیدیں لگی ہوئی ہیں تو میں ششدر رہ گیا۔ اور سر بگریبان ہو کر بیٹھ گیا اور یہ سوچ کر کہ وہ رسید ۱۹۶۳ء سے لے کر ۱۹۷۰ء کے چندہ کی تھی۔ میں سر تا پا عرق انفعال میں ڈوب گیا اور یوں محسوس ہوا کہ میں ایک خواب دیکھ رہا ہوں۔ ذوق جستجو اور بھی بڑھا اور میں نے اگلی رسیدوں کو دیکھا میرے منہ سے بے اختیار اللّٰھم اغفرلہٗ نکل گیا۔ جب میں نے وہ رسید دیکھی جس پر لکھا تھا

حصہ آمد ۸۶ء ۸۷ء ۸۸ء ۸۹ء و ۱۹۹۰ء

اور میں ایک حق الیقین تک پہنچ گیا کہ یہی وہ جماعت ہے جس کے ذریعہ اسلام کی نشأۃ ثانیہ مقدر ہے۔ کیونکہ جب اس جماعت کا ایک معذور اور اپاہج آدمی قربانی کے میدان میں اس حد تک جا سکتا ہے جس کا کوئی ذریعہ آمد نہیں اور جو اپنی ہمت سے ایک پائی بھی پیدا نہیں کر سکتا اور اسلام کی سربلندی کے لئے سالہا سال متواتر چندہ دیتا ہے تو اس جماعت کے کامیاب و کامران ہونے میں کیا شبہ باقی رہ جاتا ہے۔

بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی بلکہ مجھے اس مسل میں ایسی رسیدیں بھی نظر آ رہی ہیں جو ۱۹۰۴ء اور ۱۹۰۵ء کے حصہ آمد کی ہیں۔ یہ معمولی بات ہوتی اگر شمس الدین صاحب مرحوم نے اس سے پہلے وصیت کی ہوتی۔ لیکن ان کی وصیت ۱۹۱۹ء کی ہے اور چندہ وصیت وہ ۱۹۰۱ء سے

شروع کر کے ادا کر رہے ہیں۔
یا یوں سمجھ لیجئے کہ وہ شخص جو بظاہر معذور تھا ۱۹۱۹ء میں وصیت کرتا ہے لیکن حصہ آمد ۱۹۰۱ء سے دیتا ہے اور ۱۹۹۰ء تک دیتا ہے۔ گویا وہ تصویری زبان میں کہہ رہا ہے کہ کاش! میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی بعثت کے وقت اولین بیعت کنندگان میں ہوتا اور کاش! میں ۱۹۹۱ء تک زندگی پا کر اسلام کی خدمت کر سکتا! سوال یہ نہیں ہے کہ مرحوم شمس الدین صاحب کے چندے کے مقدار کیا تھی۔ کیونکہ ایک معذور فقیر بے نوا دے گا بھی کیا کچھ۔ مگر سوال اس جذبہ کا ہے جو اس مخلص انسان کے دل میں بے قرار تھا۔ اس نے اپنی ساری زندگی ایک چھوٹے سے کنج تنہائی میں گزار دی اور ان تنہائی کی طویل گھڑیوں میں اگر سوچتا رہا تو یہی کہ وہ اپنی دائمی معذوری کے باوجود اسلام کی کیا خدمت کر سکتا ہے۔ وہ چل نہیں سکتا تھا۔ پہلو تک نہیں بدل سکتا تھا۔ اس کی زبان میں بھی لکنت تھی۔ لیکن اس کا دل متحرک تھا خدمت اسلام کے جذبہ کے لئے۔ اس کی یہ رسید دیکھئے اس میں کتنا خلوص جھلک رہا ہے۔

''رسید ۵۷ نمبر کتاب ۱۹۳ تاریخ ۲/۱/۴۴ منجانب شمس الدین صاحب پٹھان معذور۔ مسجد مبارک قادیان مبلغ پچیس روپے صرف بہ تفصیل ذیل وصول پائے۔
حصہ آمد وصیت نمبر ۱۴۱۳ ۸۶ء و ۸۷ء و ۸۸ء و ۸۹ء و ۹۰ء۔''

یعنی وہ ۲/۱/۴۴ کو آئندہ چھیالیس سالوں تک کا چندہ ادا کر رہا ہے۔ وہ ایک معذور محض ہے۔ اس کا کوئی ذریعہ آمد نہیں۔ اگر کوئی رحمدل رہ گزر ترس کھا کر اسے کچھ دے جاتا ہے تو وہ اسے سنبھال کر رکھ دیتا ہے۔ آخر اسے کوئی کیا دیتا ہوگا۔ یہی پیسہ دو پیسے......! لیکن وہ جمع کرتا ہے اور پھر اسے آئندہ سالوں کے چندہ میں دے دیتا ہے!

یہی وہ جذبہ خلوص ہے جو جماعت احمدیہ کے اکثر افراد کے دلوں میں پایا جاتا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایسا جذبہ رکھنے والوں کی جماعت بام کامرانی تک نہ پہنچے گی۔ پہنچے گی اور ضرور پہنچے گی۔ کیونکہ اس کے بے نوا فقیر بھی خدمت اسلام کے جذبہ سے معمور ہیں۔

(بدر جلسہ سالانہ نمبر ۱۹۶۱ء)

محترم بابا خدا بخش صاحب قلی!

یہ ایک اور صاحب ہیں بابا خدا بخش صاحب قلی۔ یہ تقسیم ملک سے قبل ریلوے سٹیشن قادیان پر قلی کا کام کرتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد درویش بن کر قادیان میں رہ گئے۔ بوڑھے آدمی تھے اور نظر بھی کمزور تھی۔ مگر دل کے دریچے کھلے تھے۔ درویشی وظیفہ پاتے تھے جو نہایت ہی قلیل ہوتا تھا۔

لیکن آپ کو تعجب ہوگا یہ دیکھ کر کہ بہشتی مقبرہ میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مزار مبارک کی چار دیواری پر ایک کتبہ نصب ہے جو تعمیر چار دیواری بہشتی مقبرہ کے لئے چندہ دینے والوں کی فہرست میں سرفہرست ایک نام بابا خدا بخش صاحب درویش کا ہے۔ جس کے سامنے ۱۳۷۸/۰ روپیہ کی رقم لکھی ہے۔ یہ وہی بابا خدا بخش صاحب قلی مرحوم ہیں جنہوں نے پائی پائی جوڑ کر ایک بڑی رقم بنائی۔ اور تعمیر چار دیواری کی مد میں دے کر یہ ثابت کر دیا کہ یہ جماعت جو اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا عزم لے کر اٹھی ہے اس کے عزم کو ایک قلی سے لے کر بڑے تاجر تک کے خلوص اور جذبہ قربانی کی پشت پناہی حاصل ہے۔ یا یوں کہئے کہ اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے جو غریبوں کے دلوں میں بھی قربانی کے بے پناہ جذبات بھر دیتا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ بابا خدا بخش صاحب مرحوم نے ایک ایک پائی جمع کر کے یہ رقم بنائی تھی۔ ان کی کوئی اولاد نہ تھی۔ جس کے لئے وہ جمع کرتے تھے بلکہ وہ صرف خدا کی راہ میں دینے کے لئے جمع کرتے رہے۔ اور جذبہ تو دیکھئے کہ ایک معمولی قلی اور درویش نے ایک گراں قدر رقم جمع کر لی۔ اور اس عمل سے یہ ثابت کر دیا کہ ننھی

ننھی بے مایہ سی بوندیں جن کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ جن میں کوئی طاقت نہیں ہوتی۔ لیکن جب وہ مجتمع ہوتی ہیں تو سیلاب بن جاتی ہیں۔ اور بڑے بڑے مضبوط مکانوں اور بستیوں کی بستیوں کو بہا کر لے جاتی ہیں۔

اور یہی وہ ننھی ننھی بوندوں کا اجتماع ہے جو جماعت احمدیہ کے غریب افراد کی جیبوں سے پائی پائی نکل کر ایک نقطہ مرکزی پر پہنچ کر سیلاب بن جاتا ہے۔ اور ایک ایک پائی لاکھوں کا جزو بن

جاتی ہے۔ یہی وہ سحر ہے جو جماعت کے ہر فرد کے دل پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے پھونک دیا ہے اور آج ہماری جماعت خدا کے فضل سے ایک بڑی تنظیم کے ماتحت ایک قربان گاہ کے دہانے پر کھڑی ہے۔ ایک آتا ہے اور اپنی قربانی دے کر چلا جاتا ہے۔ اور دوسرا آتا ہے تو وہ اپنی قربانی دے جاتا ہے۔ قربانیوں کا یہ لامتناہی سلسلہ جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔ ہمارے قلی بھی اٹھیں گے تو وہ حیرت میں ڈال دینے والی قربانیاں کریں گے۔ اور ہمارے اپاہج بھی اٹھیں گے تو اسلام کی سربلندی کے لئے کسی سے پیچھے نہیں رہیں گے۔

اور جس جماعت میں یہ جذبہ پیدا ہو جائے کہ اس کے اپاہج اور قلی بھی ہراول دستوں میں شامل ہو جائیں، کون کہتا ہے کہ وہ ناکام ہوگی۔ وہ ضرور کامیاب ہوگی۔ کیونکہ اسے خدا کی تائید حاصل ہے......!!

(بدر جلسہ سالانہ نمبر ۱۹۶۱ء)

محترم دفعدار محمد عبداللہ صاحب گجراتی!

حضرت موسیٰؑ کا عصا آخر ایک بے جان لکڑی ہی تو تھا۔ جس سے آپؑ بکریوں کے لئے درختوں کے پتے جھاڑا کرتے تھے۔ لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس سے کام لینا چاہا تو یوں قدرت نمائی فرمائی کہ اسی عصا نے مصر کے شہرہ آفاق ساحروں کو مسحور و مفتوح بنا کر رکھ دیا۔ قرآن حکیم نے اس قسم کی مثالیں دے کر ذہن انسانی کو اس طرف مبذول کرایا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب علویّت اور اہمیت بخشنے پر آتا ہے تو اسی طرح ذروں کو آفتاب بنا دیا کرتا ہے۔ اور خاک نشینوں کو وہ سرفرازیاں بخشتا ہے کہ وہ بالائے افلاک پرواز کرتے ہیں۔

کچھ اسی قسم کی بظاہر بے جان۔ کم پایہ اور ناکارہ لکڑیاں تھیں جو اس زمانہ کے مامور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہاتھ میں آئیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ نے اُن سے کام لینا چاہا تو اُن میں جان ڈال کر درویش بنا دیا۔ جن کا وجود آج دنیائے احمدیت کے لئے باعث فخر و عزت بنا ہوا ہے۔ اور خدمت دین کے یہ مواقع پانے پر ہمارے درویش بھائی اللہ تعالیٰ کی جتنی بھی حمد کریں کم ہے۔

درویشوں کا یہ قافلہ سفر زندگی پر رواں دواں ہے۔ گزشتہ سترہ سالوں میں ہمارے کتنے ہی عزیز بھائی ہم سے جدا ہو کر اپنی منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہی خوش قسمت لوگ تھے جو اپنی منزل پر پہنچ گئے۔ اور جو لوگ ابھی اپنی منزل سے دور ہیں بہرحال ان کا راستہ کٹھن اور دشوار گذار ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے سب کا حافظ و ناصر رہے۔

اپنی منزل کو کامیابی اور خوش اسلوبی کے ساتھ پالینے والوں میں ہمارے ایک عزیز اور بزرگ بھائی دفعدار محمد عبداللہ صاحب درویش بھی تھے۔ ہمہ اوقات مسکراتا ہوا اور باوقار چہرہ۔ سفید ریش۔ ستر سالہ سرخ رو نوجوان۔ بغل میں رجسٹر دبائے۔ ہاتھ میں کپڑے کا ایک چھوٹا ساتھیلا لئے جب دور سے نظر آیا کرتا تو دیکھنے والے جان لیتے تھے کہ یہ دفعدار محمد عبداللہ صاحب ہیں جو چندہ وصول کرتے پھر رہے ہیں۔ پیسوں والی تھیلی اور رسید بک یوں معلوم ہوتا تھا کہ ان کے جسم کے حصے ہیں۔ اور میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ وہ ان دونوں چیزوں کے بغیر نظر آئے ہوں۔ گلی میں بازار میں مسجد میں۔ بہشتی مقبرہ آتے جاتے وقت جہاں کہیں مل جاتے یہ دونوں چیزیں ان کی ناک اور آنکھوں کی طرح ان کے ساتھ ہوتیں۔ اور آج جبکہ ہمارا وہ بھائی ہم سے جدا ہو گیا ہے یہ ناممکن ہے کہ کوئی درویش ان کا تصور باندھے تو تصور کی سکرین پر رسید بک اور پیسوں والی تھیلی نظر نہ آئے جمعہ یا عیدین کے روز تو وہ دوسرے ایام کے مقابلہ میں زیادہ مصروف اور منہمک ہوتے تھے۔ اور بقایاداروں کے پاس وہ یوں پہنچ جایا کرتے تھے۔ جیسے باز اپنے شکار کی طرف جھپٹتا ہے جہاں دیکھو کسی نہ کسی درویش کو چندہ کے لئے گھیرے رہتے تھے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ پیدائشی سیکرٹری مال تھے۔ انہوں نے ایام درویشی میں متواتر سالہا سال تک اس عہدہ پر اتنی خوش اسلوبی سے اور محنت اور جنون کے ساتھ کام کیا ہے کہ لوکل طور پر تحصیل چندہ جات کے ہر موقعہ پر ان کی یاد در آیا کرے گی......!!

ان کی اصل ڈیوٹی مرکزی لائبریری میں لائبریرین کی تھی۔ دفتری اوقات میں یہ وہ کتابوں کی عظیم الجثہ الماریوں میں گھرے ہوئے رجسٹرات کو ترتیب دیتے رہتے یا کتابوں کے ناموں کی چٹیں لکھ لکھ کر لگاتے رہتے۔ لائبریرین کا کام ایک مشکل کام ہے۔ اور اپنی نوعیت کے اعتبار سے اتنا خشک اور بظاہر سٹریل سا کام ہے کہ ہر شخص کے بس کا روگ نہیں ہوسکتا۔ لائبریری کے

کمروں میں بڑی بڑی الماریوں کے سایوں سے پیدا ہونے والی نیم تاریکی میں گونگی کتابوں سے باتیں کرنا ہر زبان دان کا کام نہیں ہوسکتا۔ مرحوم دفعدار صاحب کی تعلیم بہت کم تھی۔ اور لائبریرین کے کام سے قطعاً ناواقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہوں نے لائبریری کی ترتیب ونگرانی میں اپنے مفوّضہ فرائض کو جس ڈھنگ سے سالہا سال تک ادا کیا وہ اُنہی کا حصہ تھا۔ اور بات وہی حضرت موسیٰؑ کے عصا کی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی سے کوئی کام لینا چاہتا ہے تو بے جانی بھی جان بن جاتی ہے۔

مرحوم فتح پور ضلع گجرات (پنجاب) کے رہنے والے تھے۔ اور چونکہ یہ ایک روایت سی چلی آتی ہے کہ ضلع گجرات کے لوگ سو فیصدی چور ہوتے ہیں اس لئے اس یقینی علم کے باوجود کہ مرحوم امانت ودیانت کے اعلیٰ مقام پر تھے، اکثر بے تکلف احباب انہیں چھیڑا کرتے تھے۔ مثلاً

"دفعدار صاحب! سنا ہے آج مسجد اقصےٰ سے ایک جوتی چوری ہوگئی ہے۔ اور نام آپ کا لگ رہا ہے!"

اس پر وہ مسکرا کر کہتے کہ

"میں تو صرف جیبیں کاٹتا ہوں اور وہ بھی لوگوں کی مرضی سے"۔

(یعنی سیکرٹری مال کا کام کرتا ہوں)

اس طرح کے مزاحیہ تیر وہ برداشت بھی کرتے تھے اور خود بھی چلایا کرتے تھے۔

ایک کام جسے مرحوم کا کارنامہ سمجھنا چاہیئے یہ ہے کہ انہوں نے لگاتار دس بارہ سال تک مربی اطفال کا کام اتنی عمدگی سے کیا کہ ان کے انہماک کو دیکھ کر حیرت آیا کرتی تھی۔ چھوٹے بچوں سے نمازیں یاد کروانا۔ اذان کرانا۔ نظمیں یاد کرانا۔ انہیں مسجد میں لانا۔ نماز کی ادائیگی کا طریق سکھانا۔ صفوں میں بٹھانا۔ اور نمازوں کے اوقات میں کنٹرول کرنا یہ سارے کام وہ بڑی محبت اور لگن کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ بچے تو مرغی کے سنبھالنا بھی ایک مشکل مسئلہ ہے چہ جائے کہ آدم زاد۔ چھوٹی عمر کے بچوں میں جو شوخیاں ہوتی ہیں۔ جو چلبلا پن ہوتا ہے اور نت نئی شرارتیں سوچنے میں وہ حیرت انگیز جدتیں اختیار کیا کرتے ہیں۔ ان سے بڑے بڑے ماہرین تربیت کا دماغ چکرا جایا کرتا ہے۔ لیکن آج قادیان کے سارے والدین کو اعتراف ہے کہ ان کے بچوں کی تربیت اور نگرانی میں

دفعدار صاحب مرحوم نے نمایاں اور پر خلوص کردار انجام دیا ہے۔ بسا اوقات بعض بچوں نے مرحوم کے ساتھ اس قدر شوخیاں اور گستاخیاں کیں کہ کوئی اور ہوتا تو ایسے مواقع پر بچوں کو زمین پر دے پٹختا۔ لیکن وہ منجھا ہوا صابر بوڑھا سب کچھ برداشت کر کے بڑی ہمدردی کے ساتھ اپنا تربیتی کام کرتا چلا گیا۔

گزشتہ جلسہ سالانہ تک مرحوم اتنے صحت مند و توانا تھے اور ستر سال سے متجاوز عمر کے باوجود اس قدر سرخ وسفید تھے کہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہ آسکتا تھا کہ وہ اتنی جلدی ہم سے رخصت ہو جائیں گے۔ لیکن اس کارگہ حیات میں ایسے ناقابل یقین حادثات بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ اور اچھی صحتوں والے بلکہ عین عالم شباب میں موت کی وادی میں قدم رکھ کر اپنے پسماندگان کو اپنی زبان بے زبانی سے یہ سبق دے جاتے ہیں کہ

موت کا کوئی دن معین نہیں!

تاکہ حساس دل عبرت پکڑیں اور اس زندگی عزیز کو غنیمت جان کر اس کے ہر لحہ کو مقصدیت کے لئے صرف کریں اور آنے والے کل کا کبھی اعتبار نہ کرتے ہوئے آج سے فائدہ اٹھائیں کہ خدا جانے کل آئے یا نہ آئے۔

مرحوم جلسہ سالانہ قادیان کے بعد بڑی عمدہ صحت کی حالت میں جلسہ سالانہ ربوہ میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اور وہیں ایک مہلک بیماری نے آدبوچا۔ اور متواتر تین ماہ تک بعارضہ سرطان فریش رہے۔ مرحوم کے ایک فرزند مرزا عبدالغنی صاحب نے اپنے بیمار والد کی تیمارداری اور خدمت کے لئے اپنی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور اُن کے پاس چلے آئے۔ دوسرے بیٹوں نے بھی حق خدمت ادا کیا۔ لیکن مرحوم کی اس شدید خواہش پر کہ انہیں جلد قادیان پہنچایا جائے۔ بیماری اور معذوری کی حالت میں ہی انہیں ۲۶ مارچ کو قادیان بھجوا دیا۔ اور یہاں اپنے درویش بھائیوں کو خدمت کا مختصر سا موقعہ دے کر وہ ۱۴ اپریل کو وہاں چلے گئے جہاں ہم سب نے ایک روز جانا ہے۔ مرحوم موصی تھے (نمبر وصیت ۱۰۳۱۲) اسی رات کے دس بجے مرحوم کو بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن کر کے درویش برادری سوگوار واپس آگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے۔ اور جملہ پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے۔ آمین

(بدر ۳۰ اپریل ۱۹۶۴ء)

محترم بابا نور احمد صاحب باورچی

ایک بہت ہی خوش قسمت درویش!

میانہ قد جھکی ہوئی کمر۔ وہ کمر جو لنگر خانہ میں سلسلہ عالیہ احمدیہ کی سالہا سال خدمت کے باعث دہری ہوگئی تھی۔ سادہ دیہاتی وضع۔ سفید ریش۔ چہرے پر شرافت کے نمایاں آثار۔ ٹھنڈی طبیعت میٹھی زبان۔ خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خادم خاص اور اس مقدس خاندان کی خدمت میں غرق!

یہ تھے بابا نور احمد صاحب باورچی مرحوم۔ جو اپنا ۲۵-۱/۲ سالہ درویشی دور نہایت خاموشی اور خلوص اور متانت سے گذار کر ۸۵ سال کی عمر میں بڑی سرخ روئی کے ساتھ اپنے مالک حقیقی کے حضور ۳/۷/۳۱ کو پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

بابا جی مرحوم آج کے بابا جی نہ تھے۔ بلکہ ابتدائے درویشی سے ہی وہ بابا جی کہلاتے تھے۔ وہ اس لحاظ سے بہت ہی خوش قسمت تھے کہ نہ صرف خود انہیں درویشی کی سعادت حاصل ہوئی بلکہ ان کے ایک فرزند نذیر احمد صاحب ٹیلر اور ایک داماد فضل الرحمٰن صاحب بھی ابتداء سے ہی درویش تھے۔ اور آج تک یہاں قادیان میں ہی اپنے بیوی بچوں سمیت مقیم ہیں۔ بابا جی مرحوم کے دو اور فرزندوں کو بھی کچھ عرصہ درویشی کے ایام گذارنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ لیکن بہ تقاضائے حالات وہ بعد میں پاکستان چلے گئے تھے۔

بابا جی مرحوم ایک طویل عرصہ تک خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مختلف گھرانوں میں نجی باورچی کے طور پر کام کرتے رہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ وہ عمدہ کھانا پکانے کے ماہر تھے۔ لیکن ان مقدس خاندانوں میں کام کرنے کی وجہ سے بابا جی کے اخلاق پر جو اثر پڑا اور تادم آخر قائم رہا وہ یہ تھا کہ وہ نیکی اور تقویٰ کا مجسمہ تھے چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ذکر الٰہی ورد زبان رہتا تھا۔ وہ قریباً پندرہ سال تک خاکسار کے ہمسایہ رہے اور مجھے ان کو بہت قریب سے دیکھنے کے مواقع ملتے رہے۔ موسم گرما کے ایام میں وہ میرے مکان سے باہر ملحقہ میدان میں سویا کرتے تھے۔ اور قرآن پاک کے جو حصے یاد تھے، تلاوت کرتے رہتے یا درثمین کی نظمیں ایک لے کے ساتھ پڑھا

کرتے۔ اس بڑھاپے میں بھی انہیں درثمین کی نظمیں قرآنی آیات اور دعائیں یاد کرنے کا شوق تھا۔ کسی سے کاغذ پر یہ چیزیں لکھوا لیتے اور حفظ کرتے رہتے۔ چلتے پھرتے راستے میں جو بھی مل جاتا کاغذ کا پرزہ اس کے ہاتھ میں دے دیتے اور کہتے ذرا پڑھ کر بتا دو۔ اور پھر حفظ کرنے لگتے۔ گو وہ ان پڑھ تھے۔ لیکن میں نے مدتوں انہیں اشعار و آیات پڑھتے سنا۔ اور ان کا تلفظ بالکل درست ہوتا۔

بابا جی مرحوم کی اہلیہ مائی حسین بی بی صاحبہ جب چند سال قبل فوت ہوگئیں تو اس کا بابا جی کی صحت پر اثر پڑا۔ کچھ تو اس لئے کہ طویل زندگی کا ساتھی جدا ہوگیا۔ اور کچھ اس لئے کہ مائی حسین بی بی بابا جی کی بہت خدمت کرتی تھیں۔ اور روزانہ مالش کیا کرتی تھیں۔ مائی حسین بی بی کی وفات کے بعد جب بابا جی کے زخم ذرا مندمل ہو گئے تو اس لئے کہ بابا جی میرے ہمسایہ تھے اور میرے ساتھ بے تکلفی سے ہنسی مزاح کی باتیں کیا کرتے تھے۔ میں انہیں کہتا کہ بابا جی! مائی حسین بی بی کا کوئی خط آیا ہے؟ وہ ہنس کر کہتے تمہیں بھی کسی روز تمہاری مرحومہ بیوی کا خط آجائے گا اور اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ اس دنیا میں جو بھی آیا ہے اسے جلد یا بدیر اس کے مرحومین کی طرف سے بلاوا آنے والا ہے۔ بابا جی کی اہلیہ مائی حسین بی بی بہشتی مقبرہ میں دفن ہیں۔ میں کئی دفعہ بابا جی کو چھیڑتا!!! مائی حسین بی بی کا خط آیا ہے، لکھا ہے کہ میں نے یہاں مکان تعمیر کرلیا ہے۔ بابا جی کو جلد بھیج دو۔ بابا جی اس سے چڑتے نہیں تھے بلکہ ہنس کر وہی جواب دیتے ،کسی وقت تمہاری مرحومہ بیوی کا خط بھی تمہارے نام آجائے گا......!!

گو بابا جی اپنی زندگی کے آخری سالوں میں کافی کمزور ہو چکے تھے۔ لیکن متحرک رہتے تھے۔ ان تمام گھروں میں جن کے ساتھ بابا جی کے بزرگانہ مراسم تھے قریباً روزانہ جاتے۔ وہ جب موسم گرما میں اپنے بوجھل بڑھاپے کو قریباً گھسیٹتے ہوئے دومنزلہ مسجد مبارک کی اوپر کی چھت پر پہنچتے تو کئی نوجوانوں کی سستیوں کیلئے تازیانہ بن جاتے۔ گو وہ ریٹائر ہو چکے تھے۔ اور بڑھاپے نے اعضاء کو مضمحل کردیا تھا۔ لیکن جب سالانہ جلسوں پر ان کی خدمات کی ضرورت پڑتی تو وہ بڑے شوق سے انجام دیتے۔ اور اپنی جھکی ہوئی کمر کے ساتھ سالن کی دیگوں کے اردگرد چکر لگاتے۔

چندسال قبل باباجی فرش پر سے پھسل کر گر پڑے تو کولہے کی ہڈی میں بال آ گیا۔لوکل علاج راس نہ آیا۔تو باباجی کوامرتسروی۔ جے ہسپتال میں داخل کردیا گیا۔لیکن وہ باباجی جنہوں نے ایک ان تھک اور متحرک زندگی گزاری تھی ،انہیں ہسپتال کے بیڈ پر لیٹے رہنا سخت دوبھر تھاوہ ڈاکٹری مشورہ کونظر انداز کر کے واپس قادیان آ گئے ۔یہاں کافی دنوں تک علاج ہوا۔لیکن آخر وہ وقت موعود آ گیا جس کا کوئی علاج آج تک ڈاکٹروں سے نہیں ہوسکا۔بیماری کے ایام میں ان کے بیٹے اور بیٹی اور داماد نے بہت خدمت کی۔خاص طور پر اُن کی بیٹی اللہ رکھی صاحبہ نے اپنے بوڑھے بزرگ باپ کی بہت دعائیں لیں۔

یوں تو بیماری کے آخری ایام میں وہ کئی روز تک زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا رہے۔لیکن میرا ذوق کہتا ہے کہ انہیں گویا کسی کا انتظار تھا۔یہ ذکر ابتداء میں ہوچکا ہے کہ باباجی خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے خادم خاص تھے۔ہمارے حضرت صاحب زادہ مرزا وسیم احمد صاحب ان ایام میں دورہ پر باہر تھے۔وہ ۷۳/۸/۳۱ کو واپس تشریف لائے۔وہ امرتسر میں ٹرین سے اتر کر واپس تشریف لا رہے تھے عین اس وقت جبکہ صاحب زادہ صاحب قادیان کی حدود میں داخل ہوئے ،باباجی اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔اور یوں ہمارے ایک بزرگ درویش ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

باباجی مرحوم موصی تھے۔نماز جنازہ کے بعد انہیں بہشتی مقبرہ قطعہ ۹ میں دفن کردیا گیا۔

بہت آگے گئے ،باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں!

(بدر یکم نومبر ۱۹۷۳ء)

محترم یونس احمد صاحب اسلم

میں تو اسے شہید ہی کہوں گا۔

اگر کوئی شخص راہ حق میں خلوص' محبت' وفا اور لگن کے ساتھ انتھک کوشش کرتا چلا جائے تو وہ مجاہد ہوتا ہے۔اور اگر وہ اپنے مجاہدہ کو اس کی حقیقی معراج تک پہنچاتے ہوئے اپنی جان جاں آفریں کے سپرد کردے تو وہ شہید ہوتا ہے۔

ہمارا اکیس سال سے دیرینہ مخلص ساتھی اور درویش بھائی یونس احمد اسلم بھی یقیناً اسی زمرہ کا ایک فرد تھا۔جو مسلسل کئی ماہ تک ایک متالّم اور دردناک کیفیت میں بستر مرگ کا حلیف رہ کر ۱۵ احسان ۱۳۴۷ھش (۱۵ جون ۱۹۶۸ء) کو بہشتی مقبرہ کی مقدس اور مبشر سرزمین میں آسودہ خاک ہوا۔اور ہمارے محلّہ احمدیہ کے مختصر سے ماحول کو بے حد افسردہ بنا گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا کیا تھا؟ کسی درخت کی ایک عام اور حقیر سی شاخ بریدہ ہی تو تھی۔مگر اللہ تعالیٰ نے جب اس سے کام لینے کا فیصلہ فرمادیا تو اسے حضرت موسیٰؑ کے ہاتھ میں دے کر وہ طاقتیں بخش دیں کہ اس کے سامنے بڑے بڑے نامور ساحروں کا طنطنہ اور طمطراق خاک میں مل گیا۔اور اسی حقیر سی لکڑی کے ذریعہ سے ایک زندہ جاوید معجزہ رونما ہوا۔

یہی حال ہمارے بہت سے درویش بھائیوں کا بھی ہے۔درحقیقت ہم میں سے اکثر درویش اپنی عالمگیر احمدیہ برادری کے بے حقیقت اور حقیر افراد تھے۔لیکن جب اللہ تعالیٰ نے ان سے سلسلہ کی خدمت لینے کا فیصلہ فرمایا تو مختلف اشجار احمدیت کی ان شاخہائے بریدہ کو سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ہاتھ میں دے دیا اور یوں موجودہ زمانہ کا ایک معجزہ حضرت مصلح موعودؓ کے ذریعہ رونما ہوا۔یعنی ایک طرف تو اللہ تعالیٰ نے بے حد غیر معمولی حالات میں ان درویشوں کو احمدیت کے دائمی مرکز قادیان میں رہ کر خدمت کی توفیق عطا کی اور دوسری طرف وہ تین سو تیرہ کے مقدس اور تاریخی عدد کے اجزاء ہو کر حضرت مصلح موعودؓ کی صداقت کا نشان بن گئے۔۔۔!!

انہی میں سے ایک ہمارے درویش بھائی یونس احمد صاحب اسلم بھی تھے۔وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے۔مگر اپنی ذاتی قابلیت کے باعث دفتری کاموں کا ایک سلیقہ رکھتے تھے۔اور سلیقے کے ساتھ جب خلوص شامل ہو جائے تو وہ ایک اعتماد اور یقین کا مرتبہ حاصل کرلیتا ہے۔مرحوم کے اندر خلوص بھی تھا اور خوش سلیقگی بھی تھی۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے جس دفتر میں بھی کام کیا اپنے افسران کو مطمئن رکھا۔

مرحوم کی شادی ۱۹۵۱ء میں مکرم ماسٹر حبیب احمد صاحب آف بریلی کے ہاں ہوئی تھی۔اللہ

تعالیٰ نے مرحوم کو کثیر اولاد سے نوازا۔ موجودہ دور میں جبکہ ہمت شکن مہنگائی کا عفریت کم تنخواہ داروں کو نگلتا چلا جا رہا ہے۔ قدرتی طور پر تو اسلم صاحب مرحوم کی کثیر العیالی ان کے لئے پریشانی کا باعث ہونی چاہئے تھی۔ لیکن وہ باہمت انسان ہمیشہ اپنی کثیر العیالی پر بھی نازاں رہا۔ مہنگائی ہر سال تیز رفتاری سے بڑھتی رہی اور ادھر ہر سال مرحوم کے ہاں ایک بچہ پیدا ہوتا رہا۔ مرحوم کی سولہ سالہ ازدواجی زندگی میں دس بچے پیدا ہوئے۔ جو بفضلہ تعالیٰ زندہ موجود ہیں۔ (اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان سب کا حافظ و ناصر اور کفیل ہو) اس ازدواجی زندگی کے سولہ سال میں کچھ عرصہ اسلم مرحوم خود بیمار رہے۔ اور کچھ عرصہ ان کی اہلیہ بیمار رہیں۔ باقی عرصہ کی اگر اوسط نکالی جائے تو مرحوم کے ہاں فی سال ایک بچہ تولد ہوا۔ مگر تعجب اور آفرین ہے اس شخص پر بچوں کی یہ کثرت اور آمدن کی قلت مرحوم کے ماتھے پر شکن نہ ڈال سکی۔ مرحوم کی طبیعت میں بے حد مزاح تھا۔ چنانچہ جب کبھی بچہ تولد ہوتا تو بڑی شگفتگی اور شان بے نیازی کے ساتھ اپنے احباب کو یہ مژدہ سناتے۔ ہر نیا دن صبر آزما مہنگائی کا پیغام لئے غرباء کے دروازے پر ایک خوف پیدا کرنے والی دستک دیتا رہا۔ نتیجہ؟ ظاہر ہے وہی ہوا جو ہونا چاہئے تھا یعنی ہمارا یہ درویش بھائی اپنی کثیر العیالی کے بوجھ تلے دبا ہوا گرانی کے اژدہا کی طرف کھنچتا چلا گیا۔

مگر آفرین ہے اس باہمت اسلم پر کہ وہ گھبرایا نہیں۔ اس کی پیشانی شکنوں سے نا آشنا رہی۔ اور وہ اپنی صحت اور منحنی سے جسم کی پرواہ کئے بغیر تلاش روزگار کے لئے مختلف میدانوں میں اپنی ہمت کی کمندیں پھینکتا چلا گیا اور مسلسل کئی برس تک

ملک خدا تنگ نیست

پائے مرا لنگ نیست

کا عملی نعرہ لگاتا ہوا فرشتہ خوراک کے نقوش قدم کی تلاش میں سرگرداں رہا۔

ابتداء میں مرحوم نے سینٹ سازی کا کام کیا۔ چنانچہ سیون فلاورز کے نام سے ایک سینٹ تیار کیا۔ مگر وہ کچھ زیادہ کامیاب نہ رہا یا شاید اس لئے کہ فلاورز (بچے) سات کی تعداد سے بڑھنے کے آثار تھے۔ مرحوم نے اپنے فارغ اوقات میں مختلف ادوار میں سائیڈ بزنس کے کئی پروگرام بنائے اس نے اپنے مکان کے احاطہ میں ایک مرغی خانہ کھولا۔ اور اپنی ہمت کے مطابق

اس پر رقم بھی خرچ کی اور پسینہ بھی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے انڈوں کی خرید و فروخت کا کام بھی شروع کیا۔ وہ روزانہ قادیان اور مضافات سے انڈے خرید لاتا۔ اور بٹالہ یا امرتسر جا کر فروخت کرتا۔ دفتری اوقات کے بعد یہ اس کا روزانہ کا معمول تھا اور غیر معمولی مشقت طلب تھا۔ لیکن داد دینی چاہئے مرحوم کی ہمت کی کہ وہ ایک عزم اور لگن کے ساتھ روزانہ منجمد کر دینے والی سردی میں صبح سویرے دیہات جا کر انڈے خرید کے لاتا رہا۔ لیکن بالآخر جب پنجاب بھر کے مرغی خانے فیل ہو گئے تو مرحوم ایک بالکل انوکھے رنگ میں سرگرم عمل ہوا۔

اور ایک روز اچانک ہم نے دیکھا کہ ہمارا یہ بھائی سٹیتھوسکوپ گلے میں لٹکائے اور دوائی کی چند شیشیاں سفری بیگ میں ڈالے ایک پرانے مگر تیل سے چپڑے ہوئے سائیکل پر کہیں جا رہا ہے۔ ''بھئی کہاں جاتے ہو؟'' وہ مسکرا دیا ''اب میں ڈاکٹر بن گیا ہوں اور فلاں گاؤں میں جایا کرتا ہوں۔'' اور وہ مختصر سا انسان بچوں کی پرورش کا ایک آہنی عزم دل میں لئے مئی جون کی جھلسا دینے والی دوپہروں میں قادیان سے دس بارہ میل ے فاصلہ پر روزانہ ایک گاؤں میں جا کر دیہاتی مریضوں کی ڈاکٹری کر کے شام کو تھکن سے چور واپس آتا۔ پھر معلوم ہوا کہ اب وہ صرف ایک گاؤں میں نہیں بلکہ کئی کئی دیہات کا چکر لگا آتا ہے۔

رزق حلال، اور پھر بچوں کی اتنی بڑی تعداد کے لئے پیدا کرنا اس دور کا ایک سنگین مسئلہ سہی لیکن اسلم مرحوم کا کردار بتاتا ہے کہ اس کے دل میں درد تھا، اپنی اولاد کے لئے۔ اور ایک عزم تھا اپنی اولاد کو رزق حلال سے پالنے کے لئے۔ وہ ایک کمزور صحت اور نازک طبع انسان تھا۔ مگر بعض اوقات تو اس نے بلا مبالغہ روزانہ بیس بیس پچیس پچیس میل کا سفر سائیکل پر لُو اور سردی میں کیا۔

اسلم مرحوم نے بیشمار تدبیروں سے اپنی اس پریشانی کے ازالہ کی کوششیں کیں۔ سینٹ بنایا۔ مرغی خانہ کھولا۔ بھینس پالی۔ طبابت کی۔ ڈاکٹری کی۔ سرمہ بنایا۔ منجن تیار کیا۔ کاجل بنایا۔ انڈوں کا کاروبار کیا۔ اپنے والد محترم ماسٹر محمد شفیع صاحب اسلم کے کچھ کتابچے (مثلاً شیطان کانفرنس وغیرہ) شائع کئے۔ مرحوم نے کیا کچھ نہیں کیا جو اسے کرنا چاہئے تھا۔

وقت کے تیز دھارے اور غیر معمولی محنت کے اثرات و عواقب سے کون بچ سکتا ہے۔ یوں

تو یہ اثر کافی عرصہ پہلے سے ہو رہا تھا۔ چنانچہ مرحوم نے سامنے کے کئی دانت ۴۰-۳۹ سال کی عمر ہی میں مصنوعی لگوا لئے تھے۔ لیکن موجودہ سال کے شروع میں اس غیر معمولی محنت کا شدید رد عمل ہوا۔ اور اسلم مرحوم بیمار ہو گیا۔ دراصل بیماری تو ایک عرصہ سے اندر ہی اندر دیمک کی طرح اس کے جسم کو چاٹ رہی تھی۔ وہ خود بھی یہی سمجھتا تھا اور اس کے معالجوں کا خیال بھی یہی تھا کہ اس کے پیٹ میں جو درد اٹھا کرتا ہے وہ معمولی سا عارضہ ہے لیکن امرتسر کے .V.J ہسپتال میں ماہر ڈاکٹروں نے معائنہ کر کے بتایا کہ اسے تو کینسر ہے۔ اور کینسر بھی آخری سٹیج پر پہنچا ہوا جبکہ علاج بھی بے فائدہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ڈاکٹروں نے یہ کہہ کر چونکا دیا کہ کینسر مایوس کن حد کو پہنچ چکا ہے۔ لہذا مریض کو واپس لے جاؤ۔ اور اسے اپنے گھر میں زندگی کے آخری ایام گزارنے دو۔

اور یوں وہ اپنے مکان کے ایک گوشے میں اپنی زندگی کے آخری ایام گزارتا رہا۔ ضعف ونقاہت نے اس کے جسم وجاں کا یہ عالم بنا دیا تھا کہ بخدا اس کی طرف دیکھ کر ایک دردمند دل برداشت نہ کر سکتا تھا۔ سرطان کے ساتھ ہی خون کی کمی کے باعث اسے یرقان بھی تھا۔ آنکھیں زرد۔ چہرہ زرد۔ جسم پیلا۔ یہ کیفیت دیکھ کر درویش برادری اپنے بھائی کے لئے درد دل سے دعائیں کرتی رہی مگر وہی ہوا جو خدا کو منظور تھا اور آخر قدرت نے اسے کہہ دیا کہ تو نے اپنی کمسن اور کثیر اولاد کے لئے بیحد محنت کی ہے۔ اب تو آرام کر۔ ابدی آرام۔ اور ہم نے باچشم پرنم ۱۵ جون ۶۸ء کو اپنے مخلص درویش بھائی کو اس کی ابدی آرام گاہ بہشتی مقبرہ میں پہنچا دیا۔

اسلم مرحوم بہت ہنس مکھ اور بڑی ہی اعلیٰ مزاحیہ طبیعت کا مالک تھا۔ وہ ہنسی اور مزاح کے شگوفے چھوڑتا اور دوستوں کے میٹھی چٹکیاں لیتا تھا۔ وہ اپنے تمام درویش بھائیوں کی رنج وطرب کی محفلوں میں باقاعدہ شریک ہوتا تھا۔ بیماروں کی احوال پرسی اور تیمارداری مرحوم کا طرہ امتیاز تھا۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء تک کے قریباً ساڑھے تین سال کا عرصہ درویشوں کی شادیوں کا دور تھا۔ ہر چند روز کے بعد کوئی نہ کوئی درویش یا تو شادی کے لئے جا رہا ہوتا تھا۔ یا شادی کر کے واپس آ رہا ہوتا تھا۔ ان کی الوداعی اور استقبالی تقریبات میں مرحوم نے اپنے اوپر گویا فرض قرار دے لیا تھا کہ ہر درویش کو اس کی روانگی اور واپسی پر پھولوں کے ہار بڑے اہتمام اور محبت سے پہنایا

کرتے تھے۔ اس کے علاوہ ہر شادی شدہ جوڑے کے مکان کو رنگ برنگی جھنڈیوں سے سجایا کرتے۔ اور پھر ہر نئے جوڑے کو اپنے ہاں کھانے کی دعوت پر مدعو کرتے۔

اس کے علاوہ جلسہ سالانہ کے موقع پر یا سال کے عام دنوں میں سلسلہ کے جو مہمان آتے ان کی حسب توفیق تواضع کرتے۔

مرحوم کی آواز میں سوز اور درد تھا۔ چنانچہ سالانہ جلسوں کے علاوہ دوسرے تمام جلسوں اور تقریبات میں خوش الحانی سے نظمیں پڑھا کرتے۔ اور سامعین کو محظوظ کرتے۔

یوں تو تمام شریف احمدی اپنے اپنے گھروں کے کاموں میں بیویوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ لیکن اسلم مرحوم میں یہ وصف بہت نمایاں تھا۔ اس لئے کہ اس گھر میں تو قریباً ہر سال اس کا موقع پیدا ہوتا تھا۔ مرحوم کی اہلیہ جس نے مرحوم کی خدمت اور تیمارداری کا حق واقعی طور پر ادا کر دیا نے خواتین سے ذکر کیا ہے کہ مرحوم اتنے معمور الاوقات ہونے کے باوجود گھر کے کام کاج میں ان کا ہاتھ بٹایا کرتے۔

درویشی کی ایک خاص چیز کے ذکر کا شاید یہی موقعہ ہے۔ یہاں درویشوں کا اپنے بیوی بچوں کے علاوہ کوئی رشتہ دار نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ۔ نہ بہن نہ بھائی۔ نہ چچا نہ خالو۔ نہ بھتیجہ نہ بھانجہ۔ ظاہر ہے کہ جب ان درویشوں کی بیویاں زچگی یا عام بیماری سے فریش ہوتی ہیں تو درویشوں کو اپنے دفتری فرائض کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے علاوہ باورچیخانہ کا سارا چارج بھی سنبھالنا پڑتا ہے۔

پھر پریشانیوں اور مشکلات کے مواقع پر اگر رشتہ دار قریب ہوں اور ان سے ملنے کے مواقع موجود ہوں تو وہ رشتہ دار دکھ درد میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ گویا وہ رشتے جن کا قرب طبعاً ایک تکلیف زدہ کے لئے سکون کا سامان پیدا کر دیتا ہے ہم سب درویشوں سے دور ہیں۔ اور کسی تکلیف کی اطلاع ملنے پر بھی نہیں پہنچ سکتے۔

اب دیکھئے نا! کتنا دردناک ہے یہ واقعہ کہ مرحوم اسلم یہاں قادیان میں زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے اس کی خطرناک بیماری کی اطلاعات خطوط اور تاروں کے ذریعہ سے اس کے دور افتادہ بوڑھے والدین کو مل رہی ہیں۔ وہ جی جان سے چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ہو سکے وہ

اپنے جگر گوشے کے پاس جلد از جلد پہنچ جائیں۔ ادھر وہ پاسپورٹ اور ویزا کے حصول کی کوشش کرتے ہیں ادھر ان کا لخت جگر شدت مرض کے کرب کے ساتھ ہی اندوہ انتظار میں مبتلا ہے۔ ان مہجور اور بوڑھے والدین کی کیا کیفیت قلبی ہوگی جب انہیں معلوم ہوا ہوگا کہ

تمہیں ویزا نہیں مل سکتا

اندھے قانون کی بے رحم اور سنگین دیواریں درد میں ڈوبے ہوئے والدین اور زندگی کی آخری گھڑیاں گزارتے ہوئے بیٹے کے درمیان حائل ہوگئیں۔ بیٹا دم واپسیں تک انتظار کرتا رہا۔ مگر کوئی نہ آسکا۔ اور جب ان دکھ اور ہجر کے مارے ہوئے والدین کو اپنے فرزند عزیز کی وفات کی المناک اطلاع ملی ہوگی تو ان کے کلیجوں پر چھریاں چل گئی ہونگی۔ اور اس ناقابل برداشت صدمے سے ان کی بوڑھی کمریں جھک جھک گئی ہوں گی۔

مجھے جہاں مرحوم کے تمام اعزہ واقرباء سے دلی ہمدردی ہے وہاں میں خاص طور پر مرحوم کے والدین کو قابل مبارکباد بھی سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کی قربانی کو قبول فرمالیا۔ پنجابی زبان کی ایک کہاوت ہے

بھر یا اوس دا جانئے جس دا توڑ چڑھے۔

اور مرحوم کی وفات قابل رشک ہے اس لحاظ سے کہ وہ اپنے عہد وفا کو پورا کر گیا اور اسے بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ حصہ نمبر ۵ کی قبر نمبر ایک میں دفن ہونے کی سعادت حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنی مغفرت سے نوازے۔ اور اس کے تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق عطا کرے۔ آمین۔ اور ہم منھم من ینتظر کا انجام بھی بخیر کرے۔ آمین۔

(بدر ۱۱ جولائی ۱۹۶۸ء)

محترم چودھری محمد عبداللہ صاحب مرحوم

عرف بابا السلام علیکم

سمند تصور جب الٹی زقندیں لگاتا اور ماضی بعید کے حدود کو پھلانگتا ہوا گزرتا ہے تو بیسیوں

گزرتے ہوئے واقعات حافظے کی سکرین پر متحرک نظر آنے لگتے ہیں۔ اور سالوں قبل کی باتیں آج کی باتیں بن جاتی ہیں۔ اور ہم بیٹھے ہی بیٹھے ماضی کو اپنی گرفت میں لے کر کریدنے لگتے ہیں...... ہمارے ایک بزرگ درویش بھائی کی وفات پر پورے دس سال گزر چکے ہیں۔ لیکن آج بھی ہمارے کان اس آواز سے آشنا ہیں جو ہم پانچوں نمازوں میں سنا کرتے تھے۔ ایسی آواز جو دل کی گہرائیوں سے نکلتی تھی۔ جو خلوص ومحبت سے مملو ہوتی تھی۔ اور جو اپنا جواب لے کر چھوڑتی تھی جب اذان ہو چکی ہوتی اور نمازی مسجد میں آنا شروع ہو جاتے تو ایک سادہ مزاج انسان۔ ایک سادگی پسند درویش ہمارا ایک پرخلوص بزرگ بھائی یوں مسجد کی سیڑھیاں طے کرتا کہ بڑی سی پگڑی آدھی سر پر اور باقی آدھی کندھے پر نکلتی اور پیچھے سیڑھیوں پر گری ہوئی ہوتی۔ ایک لمبا ساڈنڈا (کھونڈا) بغل میں دبایا ہوتا اور دونوں ہاتھوں سے تہ بند تھاما ہوا ہوتا۔ آخری سیڑھی پر چڑھنے تک بمشکل تہ بند کی گرہیں لگتیں اور مسجد کے اندر قدم رکھتے ہی نہایت بلند آواز سے اتنی بلند آواز سے جیسے اذان کہی جائے۔

السلام علیکم

کہتا یہ ہمارے بزرگ بھائی چودھری محمد عبداللہ صاحب لائلپوری تھے۔ (جو محترم قاضی تاج الدین صاحب لائلپوری ناظم دارالقضاء ربوہ کے حقیقی بھائی تھے) چونکہ پورے زور کے ساتھ السلام علیکم کہنا ان کا امتیاز اور معمول تھا اور وہ درویشوں سے اور درویش ان سے ہمیشہ خلوص ومحبت سے پیش آتے تھے اس لئے درویش انہیں ایک جذبہ محبت کے ساتھ "بابا السلام علیکم" کہا کرتے تھے ہمیشہ خوش و خرم رہتے۔ اور ہر ایک سے خنداں پیشانی کے ساتھ بات کرتے باوجود بڑھاپے کے نماز روزہ کے پابند تھے۔ اور نمازوں میں اولین وقت میں مسجد پہنچ جاتے۔ اور اگلی صف میں امام کے پیچھے جگہ حاصل کرنے کی کوشش کرتے اور اس کے لئے اتنے حریص تھے کہ اگر کبھی دیر ہو جاتی اور امام کے پیچھے جگہ پر ہو چکی ہوتی تب بھی وہیں دونوں صفوں کے درمیان بیٹھ جاتے اور اقامت کے بعد جگہ حاصل کر لیتے۔

اگست ۱۹۶۲ء میں بعارضہ بخار بیمار ہوئے۔ بخار اس قدر شدید تھا کہ ۲۴ گھنٹے بیہوشی طاری رہی۔ علاج معالجہ ہوتا رہا مگر اجل کے نامہ بروں کا راستہ آج تک کس نے روکا ہے؟ اسی بخار کی

حالت میں وفات پا گئے۔

مرحوم کے والد صاحب کا نام چودھری علی گوہر صاحب تھا۔ اور چک نمبر ۳۳۲ ج ب ضلع لائلپور کے رہنے والے تھے۔ آپ کا قد میانہ اور رنگ گندم گوں تھا۔ داڑھی حنائی تھی۔ حضرت مولوی عبدالرحمٰن صاحب امیر جماعت احمدیہ قادیان مرحوم کے ساتھ وقتاً فوقتاً خوش مذاقی فرمایا کرتے تھے۔ غالباً اس لیے کہ مرحوم قاضی تاج دین صاحب لائلپوری کے حقیقی بھائی تھے۔ اور مولوی صاحب موصوف اور قاضی صاحب دارالقضاء میں اکٹھے کام کر چکے تھے۔ بلکہ اب بھی ایک قادیان میں اور دوسرے ربوہ میں ناظم دارالقضاء مرحوم نے ۷۰ سال کی عمر میں ۲۶/۸/۵۲ کو وفات پائی۔ موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں آسودۂ خواب ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔

(بدر یکم نومبر ۱۹۶۲)

محترم بابا بھاگ صاحب قادیانی

انہی سدا بہار پھولوں میں سے ایک ہمارے بزرگ بھائی بابا بھاگ صاحب قادیانی بھی تھے۔ سالہا سال کے دیکھے ہوئے مناظر آج کی طرح میرے تصور میں تازہ ہیں۔ وہ جھکی جھکی پیرانہ سالی۔ وہ خمیدہ کمر۔ ایک لمبی لاٹھی کے سہارے دھیمے دھیمے قدم اٹھاتا وہ بوڑھا درویش اپنی قربانی کو خدا کے حضور پیش کرنے کے لئے ہمارے ساتھ قریباً بارہ سال اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ وہ زندہ دل ۷۲ سالہ بوڑھا ایک ایک کر کے دن گزارتا اور راتیں کاٹتا ۸۵ کے پیٹے میں پہنچا۔ اس کے سر اور داڑھی کے سفید بال موت کا پیغام لئے اس کے سر پر منڈلاتے رہتے۔ لیکن جب وہ شگفتگی پر آتا تھا اور اکثر آتا تھا تو ایک پر سرور لے میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اشعار پڑھتا۔ طبیعت بہت پر مذاق تھی۔ اور خوش دلی ہر وقت اس کا ساتھ دیتی تھی۔ وہ سلک کی بڑی سی پگڑی باندھے اور مختلف رنگوں کی واسکٹ پہنے اپنا لمبا ڈنڈا کھٹکھٹاتے جب مسجد مبارک کی سیڑھیاں طے کرتا تو جوانوں کو بھی رشک آجاتا۔ وہ اکثر اپنے اس ولولے کا ذکر کرتا کہ خدا تعالیٰ کب اس کی قربانی کو قبول فرماتا ہے۔ آپ کا قد لمبا اور رنگ سانولا تھا۔ مرحوم موصی تھے اور تحریک

جدید کے دور اول کے مجاہد تھے۔

بوڑھا باپ ہو اور اس کا اکلوتا ہی فرزند ہو اور وہ بھی سالہا سال سے اس سے جدا ہو اور اچانک بوڑھے باپ کو یہ اندوہناک اطلاع پہنچے کہ تمہارا اکلوتا فرزند، تمہاری امیدوں کا مرکز تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے تو خمیدہ کمر اور بھی زمین بوس ہو جاتی ہے۔ لیکن ہمارے بھائی بابا بھاگ صاحب مرحوم نے یہ صدمہ بڑے صبر اور حوصلہ اور دعا کے ساتھ برداشت کیا۔ اور آخر ایک لمبی طبعی عمر پا کر معمولی سی چند روزہ بیماری کے بعد ۸۵ سال کی عمر میں ۱۳/۳/۶۰ کو اللہ تعالیٰ کے حضور پہنچ گیا۔ اور اب بہشتی مقبرہ کے قطعہ ۹ نمبر میں ابدی نیند سو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے اپنا قرب بخشے۔

آپ قادیان کے محلّہ کہاروں کے قدیم باشندے تھے۔

(بدر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۲ء)

مکرم بشیر احمد صاحب سندھی مرحوم

لیجئے یہ ہمارے ایک اور عزیز بھائی بشیر احمد صاحب سندھی ہیں جو عالم جوانی میں ہی ہم سے جدا ہو گئے۔ مرحوم جلسہ سالانہ ربوہ ۶۰ء میں شرکت کے لئے گئے تھے۔ اور نہایت ہی مختصر سی بیماری کے بعد ربوہ کے فضل عمر ہسپتال میں وفات پا کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ مرحوم ایک خاموش اور سادہ طبیعت درویش تھے۔ اور نلکا سازی کا کام کرتے۔ اولاد سے بڑی محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ بارہا دیکھا گیا کہ کہیں نلکا لگا کر آئے ہیں اور چونکہ بورنگ وغیرہ کافی محنت کا کام ہوتا ہے اس لئے ہمیشہ جب باہر سے کام کر کے آتے تو پسینہ میں شرابور ہوتے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے ایک یا دو بچوں کو کندھوں پر بٹھائے ہوتے۔ اور یہ نظارہ ایک شفیق باپ ہی سے متوقع ہو سکتا ہے۔ مرحوم تھے تو پنجابی لیکن لمبا عرصہ سندھ میں رہنے کی وجہ سے سندھی کہلانے لگے۔ اور تقسیم ملک کے وقت خدمت کے لئے قادیان میں ٹھہر گئے۔ اور آخر کشتی عمر رواں نے انہیں اس پار کے ساحل پر پہنچا دیا۔ مگر اس حالت میں کہ ان کے تین کمسن بچے شاید آج بھی اپنی ماں سے پوچھتے ہوں گے کہ ابا ربوہ سے کب آئیں گے۔ اور ماں بیچاری خدا جانے کیا جواب دیتی ہوگی۔ اور بچے تو شاید چیزی یا مٹھائی سے بہلائے جاتے ہوں گے۔ لیکن ماں جو اڑیسہ ایسے

دور دراز کے علاقہ سے پنجاب بلکہ سندھ سے ناطہ جوڑ کر آئی تھی اور احمدیت کی برکت نے زمین کی طنابیں کھینچ کر فاصلوں کو کم کر دیا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ ہی صبر بخشے اور ان سب کا حافظ و ناصر رہے۔ صدر انجمن احمدیہ قادیان مرحوم کے بیوی بچوں کو وظیفہ دے رہی ہے۔ اور یہ بھی احمدیت کی برکت ہے۔ اور عظیم الشان تنظیم الحمدللہ۔ ہمارے یہ مرحوم بھائی موصی تھے۔ اور تحریک جدید کے دفتر دوم کے مجاہد تھے۔

(بدر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۲ء)

محترم نذر محمد خان صاحب افغان مرحوم

گلدستے کے پھولوں کا تنوع دیکھئے۔ قادر مطلق نے کہاں کہاں سے پھول لا کر اس میں سجائے۔ ان کے رنگوں اور بوقلمونی کو دیکھ کر ایمان بلندی کی منازل طے کرنے کے لئے ایک پر کیف مسرت کے ساتھ پرواز کرتا ہے۔ یہ عجیب وغریب اور بے مثل قسم کے پھول ہیں جو افغانستان کی سنگلاخ زمین میں کھلے اور ماہر گلدستہ ساز نے اسے یہاں کے گلدستہ میں لا سجایا۔ نذر محمد خان صاحب مرحوم اخلاص، محنت اور جفاکشی کا مرقع۔ بیلچہ کندھے پر اور کدال ہاتھ میں۔ ہر وقت محنت کا کام کرنے کے لئے تیار۔ صبح، دوپہر، شام، رات انہیں سوائے نمازوں کے اوقات کے کسی وقت کا کوئی امتیاز نہ تھا۔ بعض اوقات سحری کے وقت کھدائی کا کام شروع کرتے اور درمیان میں نمازوں کے اوقات میں نمازیں پڑھ کر یا کھانا کھا کر رات گئے تک کام میں جتے رہتے۔ سخت جسم اور سخت جان تھے۔ ٹھیٹھ افغان تھے اور ٹھیٹھ پشتو بولتے تھے۔ ان کی بات وہ شاید خود ہی سمجھتے ہوں سننے والے کی سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ چونکہ مخلص بھی تھے اور بارعب چہرے مہرے کے مالک تھے اور پھر خالص پٹھان! مخاطب دیر تک بات سننے پر مجبور ہوتا تھا۔ گو ان کے الفاظ کے معانی کے لئے کوئی لغات مدد نہ دے سکتی تھی۔ مجذوب قسم کے انسان تھے اور اپنی مرضی سے جہاں چاہتے کھدائی کا کام شروع کر دیتے۔ لیکن قارئین کے لئے یہ بات شاید عجیب ہو کہ ایک نذر محمد خان مرحوم اکیلا دس پندرہ آدمیوں کے برابر کام کرتا تھا۔ ایک بار بہشتی مقبرہ میں جب نئی پختہ دیوار تعمیر ہو چکی اور پرانی خام دیوار کی مٹی کے بڑے بڑے ڈھیر دیوار کی اندرونی طرف

بے ترتیب صورت میں پڑے رہ گئے تو اس مٹی کو ہموار کرنا اتنا بڑا کام تھا کہ ہم کئی بار سوچا کرتے تھے کہ وقار عمل کے ذریعہ سارے درویشوں کو چند روز لگا کر یہ کام سرانجام دیا جائے۔ ایک روز کسی کو خیال آیا کہ اگر نذر محمد خان صاحب کو کسی طرح اس کام پر آمادہ کیا جائے تو وہ اکیلے اس کام کے لئے کافی ہوں گے۔ لیکن سوال یہ تھا کہ اس خالص افغان سے کہے کون؟ آخر حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب سے عرض کیا گیا کہ خان صاحب آپ کے بغیر کسی کی بات نہ مانیں گے۔ چنانچہ آپ کے فرمانے پر خان صاحب مان گئے۔ اور سینکڑوں آدمیوں کا تین روز کا کام اس اکیلے شخص نے چند روز میں ختم کر کے ہمیں دانتوں تلے انگلیاں دبانے پر مجبور کر دیا۔

اس سے ایک اور لطیف بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے ہماری جماعت کے ہر فرد کو خاندان حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ہر فرد کے ساتھ محبت اور عقیدت ہے اور دلوں کی گہرائیوں میں فرمانبرداری کے جذبات ہیں۔ نذر محمد خان صاحب مرحوم ایک مجذوب آدمی تھے۔ اور صرف اپنی لے اور دھن کے آدمی تھے۔ لیکن حضرت صاحبزادہ صاحب موصوف کے فرمانے پر فورا" تعمیل کی۔ حالانکہ جیسا کہ اکثر مواقع پر ہوا اگر کوئی دوسرا کہتا تو اسے یقیناً یہ جواب ملتا کہ

خو! ہم تمہارے باپ کا نوکر ہے؟

مرحوم کا تکیہ کلام تھا الاعمال بالنیات اور قریبا" ہر فقرے اور جملے میں یہ الفاظ بولتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مرحوم نیک نیت اور مخلص انسان تھے اور آخر اس کا اجر یوں پا گئے کہ ایک روز صبح سویرے بہشتی مقبرہ کی سڑک والے پل کے قریب کھجور کے درخت پر چڑھ گئے۔ لیکن چونکہ درخت کے کھونٹے کمزور تھے، ایک کھونٹے پر پاؤں رکھا تو وہ ٹوٹ گیا۔ درخت ڈھاب کے عین کنارے پر تھا، گرتے ہی لڑھک کر ڈھاب کے پانی میں چلے گئے۔ بلندی پر سے گرنے کی وجہ سے شدید چوٹیں آئی تھیں۔ اور چوٹیں لگتے ہی پانی میں گرے اس لئے خون جم کر رہ گیا۔ اور پورے چوبیس گھنٹے بیہوش رہ کر منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ گویا ایک بلندی سے گرے تھے اور دوسری بلندی پر چڑھ گئے۔ یعنی بہشتی مقبرہ میں دفن ہو گئے۔ اور جس کا انجام بہشتی مقبرہ ہو اس کی خوش بختی میں کسے کلام ہے۔ مرحوم چونکہ سخت جان سخت جسم اور سخت کوش تھے۔ اس لئے نفسیاتی طور پر

مرحوم کو سخت چیزوں سے رغبت تھی۔ جہاں کہیں لوہے کا کیل کانٹا وغیرہ ملتا، لا کر اپنے کمرے میں رکھ لیتے۔ مرحوم افغان ہونے کی وجہ سے نہایت حسین و جمیل نقوش اور سفید رنگ کے تھے۔ ایسا رنگ جو ساری عمر مٹی کھودنے کا کام کرنے کے باوجود میلا اور مٹیالا نہ ہوا۔ میانہ قد تھا اور بھرا ہوا پر گوشت آہنی جسم اگر بدن کو کھجانا ہوتا تو عام طریقہ استعمال نہ کرتے بلکہ اینٹوں کی پختہ دیواروں کے ساتھ کھڑے ہو کر پیٹھ اور سینے کو رگڑتے اور اینٹ کا ٹکڑا لے کر بازوؤں اور ٹانگوں کو رگڑتے۔ اپنے آپ میں مست رہ کر تنہائی کی زندگی گزار ۲۸/۵/۵۹ کو وفات پائی اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم پر اپنی رحمت کے پھول برسائے۔

مکرم برادرم مولوی محمد حفیظ صاحب ایڈیٹر بدر نے چند روز قبل ذکر فرمایا کہ مرحوم کو جب وظیفہ ملتا تو رقم جھولی میں ڈال لیتے تھے۔ اور جب انہیں بتلایا جاتا کہ آپ کے ذمہ تحریک جدید وغیرہ کا اتنا طوعی چندہ ہے تو وہ جھولی آگے کر کے کہتے اس میں سے اٹھا لو۔

وفات کے وقت مرحوم کی عمر ۷۲ سال کی تھی کہا جاتا ہے کہ مرحوم کی یہ دماغی کیفیت اس زمانہ سے تھی جب مرحوم کا ایک جواں سال فرزند فوت ہو گیا تھا۔

مرحوم موصی تھے اور تحریک جدید دفتر دوم کے مجاہد تھے

(بدر ۱۳ ستمبر ۱۹۶۲ء)

مکرم سید منظور احمد صاحب عامل مرحوم

عنوان لکھ کر سر بگر بیان ہوں۔ یہ حادثہ بیان کروں تو کیوں کر۔ شدت درد سے دل بھرا جا رہا ہے۔ اس مرجھانے والے پھول کے رنگ و نکہت کے بیان کرنے کے لئے الفاظ تلاش کر رہا ہوں۔ کچھ الفاظ سامنے آ رہے ہیں لیکن غم کا ریلا آتا ہے اور الفاظ کو اپنی زد میں بہا کر لے جاتا ہے۔ مگر مجھے بہر حال یہ فرض ادا کرنا ہے۔ اور اپنے اس مرحوم بھائی کا حق ادا کرنا ہے۔

پرندوں کے شکار کے لئے نکلا ہوں۔ قادیان سے سات میل کے فاصلے پر نہر کے کنارے شیشم کے درختوں کے سائے تلے ایک پرانی زنگ خوردہ ٹوٹی پھوٹی سی سائیکل نظر آتی ہے۔ خستگی اور کہنگی کی شکار...... کوئی مالک اس سائیکل کا نظر نہیں آ رہا ہے۔ خود رو جھاڑیوں کی اوٹ میں

سوکھے پتوں کی سرسراہٹ نگاہوں کو متوجہ کرتی ہے۔ ایک منحنی کمزور سا آدمی نظر آتا ہے۔ ہاتھ میں چھوٹی چھوٹی سوکھی ٹہنیاں ہیں۔ لڑکھڑاتی سی چال کے ساتھ کچھ قدرتی طور پر اور کچھ ضرورتاً" وہ آدمی جھکا جھکا سا چل رہا ہے۔

میں اپنے ساتھی سے کہتا ہوں اُفوہ یہ تو شاہ جی ہیں۔ یہ تو سید منظور احمد صاحب عامل درویش ہیں...... دل میں سوچتا ہوں۔ کتنا فرض شناس ہے یہ بھائی اپنے آٹھ چھوٹے چھوٹے بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اس کمزور سے جسم کو کتنی ناقابل برداشت مشقت کا سامنا ہے۔ کتنا خوددار ہے یہ شخص۔ چڑیا جتنی کمزور سی جان لئے...... اس شدید گرمی میں...... اس ٹوٹی ہوئی سائیکل پر سوار ہو کر...... قادیان سے سات میل کے فاصلہ پر۔ شیشم کی سوکھی چھوٹی ٹہنیوں کو جمع کر رہا ہے۔ وہ ٹہنیاں جنہیں ہوا کے تیز جھونکوں نے شاید اسی شخص کے لئے زمین پر گرایا تھا...... دو وقت چولہا گرم کرنے کے لئے خدا جانے یہ شخص کتنے گھنٹے کی مشقت برداشت کرے گا۔ پھر ان ٹہنیوں کا گٹھا سائیکل کے کیریئر پر باندھ کر گھر لوٹے گا...... چھوٹے چھوٹے خوبصورت نقوش والے سانولے سلونے بچے اس کا استقبال کریں گے...... صابر و شاکر بیوی خوش ہو گی۔ اور معصوم لاڈلے بچے کھانے کے انتظار میں ماں کے گرد گھیرا ڈال لیں گے! نان شبینہ کے انتظار میں!!

دفتر جا رہا ہوں۔ راستے میں ایک تنگ سی گلی ہے۔ اس گلی میں وہی سائیکل دیوار کے سہارے کھڑی ہے۔ کیریئر پر کچھ سبز چارہ ہے۔ کچھ بھوسہ ہے۔ کچھ خشک ٹہنیاں ہیں۔ شاہ جی سائیکل کے ہینڈل کا سہارا لئے کھڑے ہیں۔ چہرے پر ماندگی کے آثار ہیں۔ سائیکل کا سہارا لے کر کھڑا ہونا بتا رہا ہے کہ دور کا سفر کر کے آئے ہیں۔ ان کے مکان کا دروازہ بالکل سامنے ہے۔ مگر ۶۰ فٹ کے فاصلہ پر۔ شاید اس لئے کھڑے ہیں کہ بچے دور سے انہیں دیکھ لیں اور آ کر ان کی ٹانگوں سے لپٹ جائیں...... مگر شاید یہ بات نہیں۔ وہ تو شام کو گھر سے باہر گئے تھے...... آٹھ بچوں اور بیوی کا پیٹ بھرنے کا فرض انہیں قادیان سے دور کسی گاؤں میں لے گیا تھا۔ رات بھر وہ گندم کی گہائی مشین پر کام کرتے رہے۔ آجر نے مزدوری میں گیہوں کی بالیاں دی ہیں۔ اسی سے شاید سبز چارہ مانگا ہے۔ اور سوکھی ٹہنیاں اپنی جانی پہچانی نہر کے کنارے سے جمع کر کے لائے ہیں...... گیہوں کی بالیوں کے آٹھ ننھے منے پیارے پیارے بچوں کے پیٹ منتظر

ہیں۔ سبز چارے کے لئے دو تین کمزور سے مویشی منتظر ہیں۔ جنہیں شاہ جی نے شاید اس لئے پال رکھا ہے۔ کہ بیٹی جوان ہو رہی ہے۔ ان مویشیوں کی فروخت سے جہیز کا سامان تیار ہوگا۔ اور خشک ٹہنیوں سے چولہا جلے گا۔ جو کل سے ٹھنڈا ہے......

آہ! ہمارے شاہ جی! آپ نے اپنی ساری درویشی کے ماہ و سال اسی تگ و دو میں گزارے۔ قدرت کی فیاضی نے آپ کو اولاد کی نعمت سے نوازا۔ اور آپ نے واقعی اس قرآنی ارشاد پر عمل کر دکھایا کہ کثرت اولاد سے غم نہ کرو۔ رزق آسمان سے آتا ہے۔ وہ رزق آیا تو آسمان سے ہی، لیکن آپ نے جس ہمت اور جس قابل تقلید خودداری کے ساتھ اس رزق کو جمع کیا وہ ہمارے لئے ایک قیمتی سبق اور مشعل راہ ہے۔ آپ کی مومنانہ ہمت اور جوانمردی نے خدا جانے کتنی ہی بار کتنے ہی گرانڈیل جوانوں کو شرمندہ کیا ہوگا......!!

ہمارے یہ عزیز درویش بھائی تقسیم ملک سے قبل دیہاتی مبلغین کلاس میں تھے۔ کچھ عرصہ تک قادیان سے باہر بعض مقامات پر تبلیغ کا فرض بجالاتے رہے اور پھر مدرسہ تعلیم الاسلام میں معلمی کا فرض ان کے سپرد ہوا۔ پرائمری جماعتوں کے استاد تھے۔ گزارہ کم ملتا تھا اسی لئے اپنی ہمت کو بروئے کار لاتے تھے۔ کئی جگہ ٹیوشن کرنے سے کچھ یافت ہو جاتی تھی۔ یا پھر محنت مزدوری کر کے اپنا اور بیوی بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔ بڑے غیور اور خوددار تھے۔ اور محنت کو اپنے لئے عار نہ سمجھتے تھے۔ بہت شریف، خوددار اور خاموش طبع انسان تھے۔

زندگی کے درجنوں سالوں ہی کی طرح وہ ایک درخت کی جڑیں ایندھن کے لئے کاٹ رہے تھے۔ کلہاڑی کا اوچھا وار لکڑی کی بجائے پیر پر پڑا۔ اور کاری زخم آیا۔ جسے انہوں نے معمولی زخم سمجھ کر اہمیت نہ دی۔ زخم بڑھ گیا اور اس میں زہر پھیل گیا۔ جب چلنے پھرنے کی سکت نہ رہی تو علاج پر توجہ کی لیکن وقت ان کی توجہ کا انتظار کر کر کے گزر چکا تھا۔ ٹیٹنس کا ٹیکہ کیا گیا۔ مگر اب ٹیٹنس ٹیکہ کے بس کی بات نہ تھی۔ امرتسر وی۔ جے ہسپتال میں لے جایا گیا۔ علاج ہوتا رہا۔ لیکن علاج تو مرض کا ہوتا ہے۔ موت کا علاج ڈاکٹروں کے پاس نہ تھا۔ تقدیر شاہ جی کو کشاں کشاں عدم کی طرف لئے جا رہی تھی۔ اور آخر مورخہ ۷ اپریل ۷۵ء کو وہ وقت آ ہی گیا اور شاہ جی موت کی آغوش میں چلے گئے۔ یہاں قادیان میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ جب اچانک امرتسر سے نعش

یہاں پہنچی تو ہر لب پر آہ تھی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ دفتر یا مسجد جاتے انکا مکان میرے راستے میں ہے۔ کاش ایسا نہ ہوتا۔ معصوم خوبصورت ننھے منے بھولے بھالے بچوں کے چہروں کی اداسیاں دل میں ٹیس پیدا کرتی ہیں۔ ان کے ابد تک اس شفقت بھرے ہاتھ کے منتظر رہیں گے۔ جو باپ کا ہاتھ ہوتا ہے۔ کسی اور کا نہیں ہو سکتا۔ اور وہ غمزدہ بیوہ کسے اپنا دکھ سنائے۔ جس کے کمزور کندھوں پر آٹھ کمسن بچوں کی پرورش کا بار آن پڑا ہے۔ اور جسے جواں عمر بیوگی نے غموں کی طویل شب تار کے حوالہ کر دیا ہے۔

اے خدا تو خود ان سب کا حافظ و ناصر ہو۔ آمین

مرحوم موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔

(بدر ۸ مئی ۱۹۷۵ء)

مکرم محمد عزیز صاحب گجراتی مرحوم

ایک وقت تھا کہ ہم ماضی کی یادیں دہراتے ہوئے یہ اندازہ لگایا کرتے تھے کہ اب تک کتنے درویش پیام اجل پر لبیک کہہ کر ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔ لیکن اب...... درویشی کے ساڑھے چھبیس سال گزر جانے کے بعد...... یہ وقت آن پہنچا ہے کہ ہم یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ

کتنے درویش باقی رہ گئے ہیں!

مرور زمانہ اپنی رفتار سے چل رہا ہے۔ قدرت کا اٹل قانون ہر آن کارفرما ہے۔ ماضی کا تخیل کتنے ہی مسیں بھیگتے ہوئے کڑیل اور حسین نوجوانوں کو نگاہوں کے سامنے لاتا ہے۔ درجنوں گرانڈیل قد آور نوجوانوں کے چہرے اپنی شگفتگیوں، رعنائیوں اور خلوص کے ساتھ سامنے آن کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ پر اعتماد جوانیاں۔ جنہوں نے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شعائر اللہ کی خدمت کا عہد باندھا تھا۔ ایثار و خلوص کے وہ پتلے جنہوں نے اپنے بے حد پیارے آقا سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی آواز پر لبیک کہہ کر دین کو دنیا پر اس رنگ میں مقدم کیا تھا کہ انہوں نے جماعت کی لاج رکھ لی۔ اور اللہ تعالیٰ نے احمدیت کی تاریخ میں انہیں ایک مقام اور باب عطا فرما دیا۔ وہ مسکراتے ہوئے چہرے، موت اور خطرات کا منہ چڑاتے ہوئے

چند ثانیوں کے لئے جنت تصور وخیال بنتے ہیں۔ ماضی اپنے اوراق تیزی سے پلٹتا ہے اور ایک حقیقت ثابتہ احساس کی طنابیں کھینچ کر کہتی ہے کہ ذرا بیدار ہو۔ دیکھ! تیرے کتنے ہی ساتھی سرحد مرگ سے گزر کر خاموش وادیوں میں پہنچ چکے ہیں۔ اور پھر احساس کی رگوں میں درد کی ٹیسیں دوڑتی ہیں تخیل زخم خوردہ ہو کر ماضی سے دامن چھڑا کر حال میں پہنچتا ہے اور پھر یہ منظر سامنے آتا ہے کہ کتنے ہی مکانوں کے مکین اداس ہیں۔ کتنی ہی چار دیواریوں پر حسرتوں کے پہرے ہیں۔ کتنے ہی یتیموں کے سر باپ کے پرشفقت ہاتھ کے لمس کو ترس گئے۔ اور کتنی ہی بیواؤں کی کلائیاں چوڑیوں سے محروم ہو گئیں......!

لیکن اس کے ساتھ ہی جب ہم یہ سوچتے ہیں کہ کتنے خوش قسمت تھے ہمارے وہ بھائی جن کی قربانیاں درِقبول کو پا گئیں اور وہ سرخرو ہو کر اپنے مالک حقیقی کے حضور حاضر ہو گئے تو دل رشک سے بھر جاتا ہے اور دل کی گہرائیوں سے یہ تمنا دعا بن کے نکلتی ہے کہ خدا کرے ہماری ثابت قدمی ہم سے وفا کرے اور سرخروئی کا دن ہمارے لئے بھی آئے۔

منھم من قضی نحبہ کے اسی قافلہ میں جانے والے ہمارے ایک بھائی محمد عزیز صاحب گجراتی بھی تھے جو مکرم راجہ منصب خان صاحبؓ ساکن نورنگ ضلع گجرات مغربی پنجاب کے بڑے فرزند تھے۔ اور مرکز کی خدمت کا پرخلوص جذبہ لے کر قادیان آئے تھے اور حق یہ ہے کہ سارے دور درویشی میں انہوں نے اسی جذبہ سے خدمت کی۔ یہ معمولی نوشت وخواند جانتے تھے۔ اور مختلف مرکزی اداروں میں ڈیوٹی دیتے رہے۔ آخری ایام میں لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں باورچی کا کام کرتے تھے۔ کثیر العیالی کے باعث اپنے فارغ اوقات میں جلد سازی بھی کر لیتے تھے۔ جس سے خاصی یافت ہو جاتی تھی۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اندر ہی اندر ایک موذی مرض اس طویل القامت وجیہہ درویش کی ظاہری عمدہ جسمانی صحت کو دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ ٹی بی کے جان لیوا مرض نے اس مضبوط جوان کو چارپائی کا حلیف بنا دیا۔ امرتسر میں علاج ہوتا رہا۔ سلسلہ نے بہت سارو پیہ بھی صرف کیا مگر مرض پیچیدہ ہوتا چلا گیا۔ کئی ماہ تک یہی کیفیت جاری رہی اور انسانی کوششوں پر تقدیر الٰہی غالب آتی چلی گئی۔ اور بالآخر ۷۳/۱۲/۱۲ کو امرتسر کے ٹی بی سینی ٹوریم میں ہمارے اس عزیز بھائی کو دائمی اجل وہاں لے گیا

جہاں ہم سب نے جلد یا بدیر جانا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم اپنے پیچھے ایک بیوہ اور آٹھ بچے چھوڑ گئے جن کی کفالت صدر انجمن احمدیہ کر رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام پسماندگان کا حافظ و ناصر رہے۔ اور مرحوم کی مغفرت فرمائے۔ مرحوم موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔

(بدر ۶ جون ۱۹۷۴ء)

محترم بابا جان محمد صاحب سیالکوٹی

ابتدائے درویشی میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے ارشاد کی تعمیل میں جو لوگ اپنے اہل وعیال اور مال ومنال کی محبتوں اور قربتوں کو ترک کر کے درویشانہ زندگی کے ذریعہ سے رضائے الٰہی کے حصول کے لئے قادیان تشریف لائے تھے۔ انہی میں سے ایک ہمارے بزرگ اور درویش بھائی بابا جان محمد صاحب بھی تھے۔ آپ کا اصل وطن موضع گٹھیالیاں ضلع سیالکوٹ (مغربی پاکستان) تھا اور اسی نسبت سے آپ ''بابا جان محمد گٹھیالیاں'' کہلاتے تھے۔ باباجی نے اپنی درویشی کے کئی سال حضرت اماں جانؓ کے کنوئیں والے صحن کے حصے میں گزارے اور اس طرح آپ اور آپ کے دوسرے معمر ساتھی جو دارالمسیحؑ کے اسی حصہ میں رہتے تھے حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ مدظلہا العالی کے اس ولولہ انگیز شعر کے براہ راست مخاطب قرار پائے

تمہارے دم سے ہمارے گھروں کی آبادی
تمہاری قید پہ صدقے ہزار آزادی

باباجی اسی صحن میں ننگی کھری چارپائی پر بیٹھ کر ایک تکیئے کے اوپر بڑی تقطیع اور جلی حروف والا قرآن کریم رکھ کر بہت بلند آواز میں تلاوت کرتے رہتے تھے۔ اور نمازوں کے اوقات میں مسجد کا رخ کرتے تھے یا پھر اپنا مخصوص ایلومینیم کا پیالہ لئے کھانا لینے لنگر خانہ جایا کرتے تھے۔

درویشی کے ابتدائی ایام میں آپ مختلف مقامات پر پہرہ وغیرہ کی ڈیوٹی پر متعین رہے۔

لیکن جب بڑھاپے نے توانائیاں چھین لیں اور پیر فرتوت ہو کر رہ گئے تو ڈیوٹیاں معاف ہو گئیں۔اور تلاوت قرآن کریم، نمازیں اور دعائیں ہی اجزائے زندگی ہو گئیں۔

آج میرا تصور اس بھولی بھالی اور سادہ سی شخصیت کو تلاش کر رہا ہے جو دیسی وضع کا مضبوط موٹا جوتا پہنے گھٹنوں سے ذرا نیچے تک کا تہ بند باندھے کلی دار لمبا کرتہ پہنے موٹے شیشوں کی عینک لگائے کندھے پر چادر ڈالے اور ہاتھ میں بید کا لمبا سوٹا لئے محلّہ احمدیہ کی گلیوں میں ہمارے روحانی ماحول کی ایک کڑی بن کر رواں دواں رہتی تھی۔ایسے ہی معمر بزرگ تھے جو رُکعاً سُجّداً کی تفسیر تھے۔اور جن کی دعاؤں اور صالحیت کے سہارے اللہ تعالیٰ کے فضلوں کو جذب کر کے ہماری درویشی سن بلوغ کو پہنچی۔

بابا جی کی درویشی کے طفیل ان کی اہلیہ زینت بی بی صاحبہ کو یہ سعادت حاصل ہوئی کہ وہ نومبر ۵۳ء میں پاسپورٹ اور ویزا لے کر قادیان کی زیارت اور بابا جی سے ملاقات کے لئے قادیان آئیں۔اور نہایت مختصر سی علالت کے بعد ۲ دسمبر ۵۳ء کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ میں دفن ہوئیں۔اور اس طرح وہ خوش قسمت بڑھیا درویشی کے لئے اپنے خاوند کی قربانی دے کر اس قربانی کا اجر پا گئی۔

بابا جی مرحوم موصی تھے ۶۵/۱/۲۲ کو وفات ہوئی اور اسی روز بہشتی مقبرہ کے قطعہ ۹ میں ابدی نیند سو گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۲۹ جولائی ۱۹۶۵ء)

محترم شیخ غلام جیلانی صاحب مرحوم

میرا تخیل جب حال کے جھروکوں میں سے ماضی کو پلٹ پلٹ کر دیکھ رہا ہوتا ہے تو تصور کے افق پر ایک بہت ہی نورانی سی تصویر ابھرتی ہے۔متناسب خدوخال متشرع داڑھی۔شمسی چہرہ۔ باریک ترشے ہوئے نقوش۔اور انوار سے پر پیشانی۔یہ سفید ریش بزرگ ہمارے بہت ہی معزز درویش بھائی شیخ غلام جیلانی صاحب تھے جنہوں نے درویشی کا اکثر حصہ دارالمسیح کے اندر رہ کر گزارا۔پہلے آپ مسجد مبارک سے ملحق حضرت اماں جانؓ کے دالان میں مقیم رہے۔اور پھر

حضرت اماں جانؓ کے کنویں والے صحن کے غربی جانب والے ایک حجرے میں گوشہ نشین رہے اور نہایت خاموشی اور صبر و سکون کے ساتھ درویشی گزار کر اپنی منزل مقصود کو پا گئے۔

شیخ صاحب مرحوم نہایت دھیمی رفتار سے چلتے تھے۔اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آپ وَلَا تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحاً کے معنے سمجھا رہے ہیں۔وہ جب سر جھکائے بنے تلے قدم اٹھاتے چلتے تھے تو درویشوں کے جذبات احترام جا بجا ان کا استقبال کرتے تھے۔

یہ نظارہ دیکھ کر تو عقل محو حیرت ہو جاتی تھی کہ وہ معمر انسان جو اپنے بڑھاپے کے باعث ہموار زمین پر بھی نہایت آہستگی اور احتیاط سے چلتا تھا۔وہ سردی کے دنوں میں ایک منزل اور گرمی کے دنوں میں دو منزل کی سیڑھیاں طے کر کے مسجد مبارک میں اکثر اوقات تمام نمازیوں سے پہلے پہنچ جاتا تھا۔اور مسجد کے ایک گوشے کو آباد رکھتا تھا۔مسجد مبارک کے دائیں طرف والے حصے میں دارالفکر سے ملحق ان کی ایک مخصوص نشست گاہ تھی جہاں وہ گھنٹوں بیٹھے ذکر الٰہی میں مشغول رہتے تھے۔

شیخ صاحب مرحوم بہت کم گو اور تنہائی پسند درویش تھے اور اپنی درویشی کے پندرہ سال بے حد صبر و سکون کے ساتھ کنج عزلت میں گزارے۔قریباً" دو سال قبل آپ پاسپورٹ پر اپنے وطن سامان ضلع کیمل پور (مغربی پاکستان) گئے تھے۔اور وہیں سرطان کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔اور ڈیڑھ سال تک وہیں زیر علاج رہے۔جب مرض میں افاقہ نہ ہوا اور ویزا کی معیاد کی توسیع بھی ممکن نہ رہی تو آپ شدید بیماری کی حالت میں ہی واپس قادیان آ گئے۔اس حالت میں کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو چکے تھے۔یہاں انہیں احمدیہ ہسپتال میں زیر علاج رکھا گیا۔لیکن آخر ۶۵/۵/۱۶ کو اللہ تعالیٰ نے اپنے پاس بلا لیا اور موصی ہونے کی وجہ سے بہشتی مقبرہ کا قطعہ نمبر ۹ ان کی آخری آرام گاہ بن گیا۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔ع

بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شیخ صاحب مرحوم ایک ایسا خوش رنگ اور خوش وضع پھول تھا جو ضلع کیمل پور (حال مغربی پاکستان) سے توڑ کر قادیان لایا گیا۔اور درویشوں کے گلدستے میں سجایا گیا تھا۔اور

ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است

کے مصداق اس گلدستے میں تین سو تیرہ مختلف رنگ و بو رکھنے والے پھول تھے جن میں بعض خوشبو ریزیاں کر کے زمانے کی تمازت سے مرجھا گئے۔ اور میرے نزدیک تو خوش بخت تھے وہ پھول جو اپنی زندگی میں اس ماحول کو معطر بنا کر مرجھا گئے۔ کیونکہ وہ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔ اور پھر آئینہ ع

شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہ آئینہ ساز میں

(بدر ۲۹ جولائی ۱۹۶۵ء)

مکرم فضل الٰہی صاحب گجراتی مرحوم

ہمارا ایک عزیز درویش بھائی جو فرمانبرداری کا مجسمہ تھا جسے دیکھ کر ہمت و شجاعت کے معنی ذہن میں متحضر ہو جاتے تھے۔ جسے اگر کہا جاتا کہ تمہارے ذمہ فلاں ڈیوٹی لگائی جا رہی ہے تو اس ڈیوٹی کی تفاصیل سننے تک اس کے قدم مقام ڈیوٹی کی طرف اٹھ جانے کے لئے بیتاب رہتے۔ اس کا جسم متحرک رہتا۔ اور وہ تفاصیل سننے تک کئی بار قدم اٹھا کر روکتا...... اور پھر اپنا مفوضہ کام سرانجام دینے تک وہ دم نہ لیتا تھا۔ اس کے سپرد کوئی کام کر دینے سے طبیعت میں ایک اطمینان پیدا ہو جاتا تھا کہ اب یہ کام یقیناً وقت سے بھی پہلے ہو جائے گا۔ جن لوگوں کو ایک عہدہ دار کی حیثیت سے لوکل انجمن احمدیہ قادیان کی خدمات بجا لانے کا موقعہ ملا ہے وہ اس کی شہادت دیں گے۔ راقم الحروف نے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے بیسیوں بار اس کا تجربہ کیا۔ اور جہاں کہیں محنت اور وقار عمل کا کام ہوتا مجھے اپنے بھائی فضل الٰہی مرحوم کی ضرورت ہوتی تو بلوانے پر وہ بھاگ کر پہنچتا۔ اور جو کام اس کے سپرد کیا جاتا وہ بڑے خلوص اور محنت کے ساتھ اسے انجام دیتا۔

وہ ایک مضبوط اور بہادر نوجوان تھا۔ اور اس کی فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کا یہ عالم تھا کہ ''جاؤ'' کہنے پر وہ جا چکا ہوتا۔ اور ''آؤ'' کہنے پر گویا وہ پہلے ہی آ چکا ہوتا۔ اس نے اپنی ساری درویشی میں کبھی کسی مفوضہ کام کے بارہ میں تأمل یا تخلف نہ کیا۔

فضل الٰہی مرحوم قادیان آنے سے قبل ان پڑھ تھا لیکن زمانہ درویشی میں اس نے محنت کر کے پڑھنا سیکھ لیا تھا اور یہ معمولی لٹریچر پڑھ لیتا تھا۔ درویشی ہی میں مرحوم نے معماری کا کام بھی سیکھ لیا تھا اور تعمیرات کے شعبہ میں کافی عرصہ کام کیا چنانچہ چاردیواری بہشتی مقبرہ کی تعمیر میں بھی مرحوم نے حصہ لیا۔ اور بہشتی مقبرہ کی سڑک کی تعمیر و تزئین میں بھی حصہ لیتا رہا۔

بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ اور نمبر ۹ کی وہ قبریں جو تقسیم ملک کے بعد کھودی گئیں ان میں سے اکثر کی کھدائی مرحوم ہی نے بعض اپنے ساتھیوں سمیت کی۔ قبر کی کھدائی کا کام چونکہ محنت اور جلدی کا متقاضی ہوتا ہے اس لئے اکثر مرحوم کو ہی یہ خدمت سپرد کی جاتی۔

مرحوم نہایت صحت مند اور طاقت ور نوجوان تھا۔ اور پنجاب کے مشہور کھیل کبڈی کا ماہر کھلاڑی تھا اور کبڈی کے بڑے بڑے معرکوں میں شوق سے حصہ لیتا اور داد شجاعت دیتا تھا۔ چنانچہ درویشی کے ابتدائی ایام میں ہماری احمدیہ کبڈی ٹیم جس نے کئی اچھے میچ جیتے تھے، مرحوم اس ٹیم کا کیپٹن ہوتا تھا اور قادیان میں ''یوم آزادی'' وغیرہ تقاریب کی کھیلوں میں بھی مرحوم ہمیشہ انعام پاتا رہا۔

فضل الٰہی مرحوم میاں محمد عبداللہ صاحب احمدی سکنہ کھاریاں ضلع گجرات (مغربی پاکستان) کا فرزند تھا۔ جماعت احمدیہ کھاریاں نے اپنے پانچ فرزند درویشی کی قربان گاہ پر دیئے جن میں سے تین منھم من قضٰی نحبہ کی فہرست میں آ چکے ہیں۔ اور دو منھم من ینتظر کی فہرست میں ہیں اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ فوت ہونے والے ہمارے تینوں بھائی اچانک اور عالم جوانی میں فوت ہوئے۔

افسوس کہ ہمارا یہ بھائی ۹ جولائی ۱۹۶۲ء کو اچانک ایک حادثہ کا شکار ہو کر ہمیں داغ مفارقت دے گیا اور پیچھے جوان بیوہ اور دو کمسن بچے چھوڑ گیا۔ یا پھر غمزدہ بوڑھے والدین اور تین بھائی اور دو بہنیں جو اس وقت کھاریاں میں ہیں۔

یوں تو ہمارے فوت ہونے والے تمام درویش بھائیوں کی وفات پر درویش برادری نے شدید رنج و غم محسوس کیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ دو مواقع ایسے بھی آئے جبکہ درویش اپنے آنسوؤں کے آخری قطرے تک روئے۔ ایک حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانیؓ کی وفات پر اور

دوسرے فضل الٰہی مرحوم کی وفات پر۔

مرحوم موصی تھا۔ اس لئے بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں سپرد خدا کیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور پسماندگان کو صبر کی توفیق بخشے۔

(بدر ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء)

مکرم نیاز علی صاحب مرحوم کھاریاں

پھول تو کھلنے کے بعد کچھ وقت تک اپنے رنگ ونکہت سے فضاؤں کو معطر کر جاتے ہیں لیکن کچھ غنچے ایسے بھی ہوتے ہیں کہ چٹکنے سے پہلے ہی بادسموم کا کوئی جھونکا انہیں مرجھا جاتا ہے۔ اور وہ سرسبز وشاداب شاخ کو حسرت بھری الوداع کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ ایسا ہی ایک غنچہ ناشگفتہ ہمارا بھائی نیاز علی بھی تھا۔

کاش! زمانہ اپنے اوقات سے ۳ اکتوبر ۱۹۴۷ء کا دن خارج کر دیتا کہ قادیان کی بستی پر کرب و بلا کا یہی دن تھا۔ قادیان کے بیرونی محلوں پر حملہ ہو چکا تھا۔ اور عورتوں کو ان محلوں سے نکال کر محفوظ مقامات پر پہنچانے کا کام ہو رہا تھا۔ ہمارے چند نوجوان ظلم کی اس بھڑکتی ہوئی آگ میں کود کر اپنی ماؤں بہنوں اور بیٹیوں کی عصمت بچانے کے لئے کوشش کر رہے تھے۔ لوگ کشتہ کھانا تو اکثر جانتے ہیں لیکن کشتہ بننا تو کسی کسی کو آتا ہے۔

مرحوم نیاز علی محلہ دارالرحمت میں اسی کام پر مامور تھا۔ وہ مسجد دارالرحمت والے چوک میں تھا۔ بس اس کے ساتھی اتنا ہی بتا سکے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا وہ کہاں گیا کہیں سے گولی چلنے کی آواز آئی تھی۔ بس یہیں یہ روایت ختم ہو جاتی ہے مرحوم کی نعش باوجود تلاش کے نہیں مل سکی تھی۔

نیاز علی مرحوم میاں غلام محی الدین صاحب گوجر احمدی سکنہ کھاریاں ضلع گجرات کا فرزند تھا اور بائیس سال کی عمر میں شہید ہوا۔ مرحوم خوش قسمت تھا کہ اس نے وفات کے وقت قادیان کی سرزمین پائی اور مرحوم کے پسماندگان کے لئے یہ امر باعث فخر ہے کہ ان کا عزیز قادیان کے کام آیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

(بدر ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء)

مکرم عبدالرحیم خان صاحب افغان!

کابل کی سخت جان اور سنگلاخ سرزمین میں ایک اور پھول کھلا تھا جسے خلافت ثانیہ کے عہد میں قادیان آنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ میاں عبدالرحیم خان صاحب افغان درویش حضرت صاحبزادہ عبداللطیف صاحب شہیدؓ کے ہم وطن تھے۔ اور ہجرت کر کے قادیان چلے آئے تھے۔ یہاں مختلف صیغوں میں وہ پہرہ دار کے فرائض سرانجام دیتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد خدمت مرکز کے جذبہ سے قادیان میں ہی ٹھہر گئے تھے۔ اور اپنی عمر کے مناسب حال مختلف ڈیوٹیاں دیتے رہے۔

نہایت خاموش طبع اور تنہائی پسند انسان تھے۔ نمازیں اور ذکر الٰہی ہی ان کا مشغلہ رہا۔ نماز کے وقت سے بہت پہلے مسجد میں پہنچ جاتے اور ذکر الٰہی کرتے رہتے۔

مرحوم کی کچھ تھوڑی سی زرعی زمین بھی احمدیہ محلہ کے شرقی جانب ڈھاب کے کنارے پر واقع تھی۔ اسی میں ایک چھوٹا سا مکان اور باغیچہ تھا۔ یہ زمین تقسیم ملک کے بعد بھی مرحوم کے ہی قبضہ میں رہی اور اس کی دیکھ بھال کے لئے اکثر وہاں جایا کرتے تھے۔ لیکن بعد میں یہ ساری جائداد صدر انجمن احمدیہ قادیان کے نام ہبہ کر دی تھی۔

مرحوم بڑے نیک سیرت۔ اور کم گو انسان تھے۔ چونکہ عبادات اور ذکر الٰہی میں بڑا شغف تھا اس لئے اکثر سچی خوابیں بھی آتی تھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک درویش بھائی کے متعلق خواب میں دیکھا کہ ان کے مکان کے اندر آگ لگی ہوئی ہے اور مکان کی ساری کھڑکیوں میں سے دھواں نکل رہا ہے۔ یہ خواب اس درویش کو سنا دی تا کہ وہ استغفار کریں۔ بعد میں اس درویش کو واقعی ایسی شدید پریشانیاں لاحق ہوئیں کہ واقعی گویا ان کے مکان میں آگ لگی اور واقعی کچھ عرصہ تک خواب کی کیفیت طاری رہی۔

مرحوم مورخہ ۱۳؍اکتوبر کو فوت ہو کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔ وفات کے وقت عمر ۸۰ سال کے قریب تھی۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔

(بدر ۱۳ دسمبر ۱۹۶۲ء)

محترم میاں اللہ دتہ صاحب مرحوم

دوالمیال جہلم

بمبئی کی ایک پرفیومری کمپنی اخباروں میں ایک اشتہار ''عطر مجموعہ'' کے نام سے دیا کرتی ہے۔ جسے کئی عطروں کے امتزاج سے تیار کیا جاتا ہے۔ گلاب کا عطر چنبیلی کا عطر۔ عطر حنا وغیرہ کئی قسم کے عطروں کا محلول جو کافی عمدہ اور مشہور ہے۔ گلاب کا پودا الگ قسم کا ہوتا ہے۔ اس کے پھول کے رنگ و بو میں ایک عجیب کیف ہوتا ہے۔ اور جمالیاتی حس رکھنے والوں کے لئے یہ پھول ایک روحی سرخوشی مہیا کرتا ہے۔ چنبیلی کا پودا ایک دوسری قسم کا ہوتا ہے۔ جس کے پھولوں کا رنگ اور ان کی خوشبو گلاب کے پھول سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔ لیکن اپنی ذات میں اس کے اندر بھی ایک کشش ہوتی ہے ایک حسن ہوتا ہے۔ اور ایک سامان کیف وسرور ہوتا ہے۔ اور یہی حال عطر حنا کا ہے۔ لیکن یہ ساری چیزیں جن کی شکلیں اور بوئیں مختلف ہوتی ہیں۔ اپنے اندر ایک کیف مشترک رکھتی ہیں۔ جو دل و دماغ کو لذت وسرور بخشتا ہے۔ اور ان کا امتزاج واقعی اپنے اندر دلکشی رکھتا ہو گا۔

لیکن جس ''عطر مجموعہ'' کا میں ذکر کر رہا ہوں' اشتہاری عطر مجموعہ کی اس کے سامنے کیا حقیقت ہے! یہ گلدستہ جو باغ عالم کے مالی نے قادیان کی بستی کے اس الگ تھلگ سے کونے میں سجایا' اس میں بھی مختلف قسم کے پھول تھے۔ کوئی جنوبی ہند سے لایا گیا تھا اور کوئی شمالی ہند سے۔ کوئی مشرقی ہند سے لایا گیا اور کوئی غربی ہند سے۔ اور یوں یہ متنوع اور خوش رنگ اور خوشبودار پھولوں کا گلدستہ سجایا گیا۔

۴۷ء کے آخر سے ۵۰ء کے اوائل تک ایک ساٹھ سالہ بوڑھا دن کے تمام اوقات بہشتی مقبرہ میں چاردیواری کے اندر اور سڑک پر جھاڑو دیتے اور صفائی کرتے نظر آیا کرتا تھا۔ گرد و غبار سے بال' چہرہ اور کپڑے اٹے ہوئے۔ اور زبان ولب مسلسل اوراد و تلاوت قرآن کریم میں مصروف جنبش۔ یہ میاں اللہ دتہ صاحب ولد میاں شہباز خاں صاحب تھے جو دوالمیال ضلع جہلم کے رہنے والے تھے۔ اور خدمت مرکز کی سعادت پانے کے لئے یہاں آئے تھے۔ وہ اپنے

سارے ماحول سے منقطع رہ کر نہایت خاموشی کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے لو لگائے اپنی درویشی کا زمانہ گزار کر وفات پا گئے۔ نماز۔ روزہ اور تہجد کے پابند تھے۔ اپنی جائے رہائش سے نکل کر مسجد اور مقبرہ بہشتی کے علاوہ کبھی کہیں نہیں جاتے تھے۔ صبح کی نماز پڑھ کر جھاڑو ٹوکری لئے بہشتی مقبرہ میں پہنچ جاتے اور غروب آفتاب تک اکثر انہیں وہیں مصروف کار دیکھا جاتا۔ اتنے خلوص اور محبت سے صفائی کرتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ بہشتی مقبرہ میں کسی کی آمد آمد ہے اور وہ راستہ صاف کر رہے ہیں۔

مگر کسے معلوم تھا کہ وہ اپنے لئے ہی راستہ صاف کرتے تھے۔ اور جب ۱۰-۲-۵۰ کو ان کی وفات ہوئی اور ان کی نعش ان راستوں سے گزری تو مرحوم کی اس خدمت کو یاد کر کے ہمارے دلوں سے دعائیں نکل نکل گئیں کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات بلند فرمائے۔ مرحوم بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں سپرد خدا کئے گئے۔

(بدر ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

محترم میاں احمد الدین صاحب آف بّے ہالی

زندگی کیا ہے۔؟ ایک ٹرین ہے۔ جس میں ہم سب سوار ہو کر عالم آخرت کیطرف رواں دواں ہیں۔ جس کا ٹکٹ جس سٹیشن تک کا ہوتا ہے وہ وہیں اتر جاتا ہے اور ٹرین آگے روانہ ہو جاتی ہے۔ قطع منزل کے اوقات مختلف سہی لیکن حد منزل ہم سب کی ایک ہے۔ اور دنیا کے اربوں انسانوں کا ایک بہت بڑا قافلہ عالم آخرت کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اور بڑھتا چلا جائے گا۔ کچھ مسافر اترتے رہیں گے اور نئے مسافر سوار ہوتے رہیں گے۔ اور یہ مدوّر گزرگاہ یونہی سینہ زمین پر لیٹی رہے گی۔

ہمارے ایک درویش بھائی میاں احمد الدین صاحب ولد حکیم اللہ بخش صاحب سکنہ بّے ہالی ضلع گورداسپور تھے جو تقسیم ملک سے کافی عرصہ قبل ہی سے قادیان میں رہائش پذیر تھے۔ ہمارے ساتھ بارہ منزلیں طے کرنے کے بعد ۱۶/۷/۵۹ کو امرتسر کے وی۔ جے ہسپتال میں وفات پا گئے۔ اور نعش ٹرک کے ذریعہ قادیان لا کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن کی گئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم ایک خاموش طبیعت، سادہ لباس اور نیک طینت درویش تھے۔ شروع درویشی میں درویشی وظیفہ لیتے رہے۔ لیکن ۵۲-۱۹۵۱ء میں صدر انجمن احمدیہ کی تحریک پر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔ شروع ایام میں چند بکریاں بھی پالی ہوئی تھیں۔ اور صدر انجمن احمدیہ کے دفاتر میں ڈیوٹی بھی دیتے تھے۔ لیکن فراغت کے بعد عطاری کی دکان کھول لی تھی۔ مختلف قسم کے عرق نکال کر اور اچار مربے وغیرہ تیار کر کے بیچا کرتے تھے۔ اور اجرت پر مولوی عبدالواحد صاحب دکاندار کی دکان پر بھی کام کیا کرتے تھے۔ مجرد تھے، گذارہ ہو جاتا تھا۔ مرحوم نے یکے بعد دیگرے دو شادیاں تقسیم ملک سے قبل کی تھیں۔ لیکن دونوں کا نباہ نہ ہو سکا تھا۔ درویشی میں تجرد کی زندگی گزارتے رہے۔ وفات سے کچھ عرصہ قبل مرحوم شادی کروانے کی کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ اسی امید پر معمولی زیور بھی تیار کروالیا تھا۔ مگر پیغام اجل اچانک آپہنچا۔

مرحوم نے ۵۹/۷/۱۴ کو مولیوں کے ساتھ روٹی کھالی تھی۔ اور غالباً مولیاں کثیر تعداد میں کھا کر پانی پی لیا تھا۔ اس سے بیمار ہو گئے۔ پیٹ میں شدید درد اور اپھارہ ہو گیا۔ پاخانہ بند ہو گیا۔ احمدیہ ہسپتال میں علاج کیا گیا جو کارگر نہ ہوا اس لئے ۵۹/۷/۱۶ کو امرتسر لے جا کر وی۔ جے ہسپتال میں داخل کروایا گیا لیکن وفات کا وقت آچکا تھا۔ لہٰذا ساری کوششیں ناکام رہیں۔ اور اسی روز تیسرے پہر مرحوم وفات پا گئے۔

میاں عبدالرحیم صاحب درویش (دیانت سوڈا واٹر فیکٹری) جو مرحوم کے بہنوئی ہیں نے بتایا کہ تقسیم ملک سے قبل موضع بے ہالی میں حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک صحابی حضرت منشی جھنڈے خان صاحبؓ بھی تھے جو پنجابی زبان کے شاعر تھے۔ اور "سوانح عمری" اور "چمکار احمدی" وغیرہ کے مصنف تھے حضرت منشی صاحب کی ایک لڑکی کے سوا کوئی اولاد نہ تھی۔ منشی صاحب جن ایام میں فوت ہوئے، احمدیت کی مخالفت زوروں پر تھی۔ اور اس گاؤں میں منشی صاحب اور میاں احمد الدین صاحب درویش کے والد حکیم اللہ بخش صاحب کے سوا کوئی احمدی نہ تھا۔ چنانچہ منشی صاحب کے غیر احمدی رشتہ دار چاہتے تھے کہ ان کی نعش گاؤں کے قبرستان میں دفنا دی جائے۔ لیکن چونکہ منشی صاحب موصوف موصی تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی تھے اس لئے میاں احمد الدین صاحب کے دل میں جوش اٹھا کہ جیسے بھی ہو نعش کو قادیان پہنچانا

چاہیئے۔ ان کے والد حکیم اللہ بخش صاحب بھی اتفاق سے کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ تاہم میاں احمد الدین صاحب نے ہمت کر کے کسی سکھ دوست کی بیل گاڑی حاصل کی۔ اور رات کے وقت چوری چھپے نعش کو نکالا۔ اور راتوں رات قادیان پہنچا دیا۔ اور یہ بڑی جرأت اور ہمت کا کام تھا۔

اسی بناء پر گاؤں میں مخالفت شدید ہو گئی۔ اور میاں احمد الدین صاحب کے والد صاحب کو اپنے گاؤں سے ہجرت کر کے مستقل طور پر قادیان آجانا پڑا تھا۔ اس وقت قادیان میں مرحوم کی ایک بھانجی (اہلیہ مولوی بشیر احمد صاحب بانگروی درویش) ہے اور ان کی ایک ہمشیرہ (اہلیہ میاں عبدالرحیم صاحب دیانت درویش) ربوہ میں ہے۔

(بدر ۱۸/۱۰/اکتوبر ۱۹۶۳ء)

محترم میاں غلام محمد صاحب شہید

معمر باپ نے اپنے اکلوتے فرزند کو، اپنے لخت جگر کو، اور اپنے بڑھاپے کی خوش آئیند امیدوں کی آماجگاہ کو محض خدمت مرکز کے جذبہ سے اپنے سے جدا کرنا منظور کر لیا تھا اور ماں نے اپنے جگر گوشہ کو الوداع کہتے ہوئے تاکید کی تھی کہ دیکھو بیٹا! تم قادیان جا رہے ہو کبھی کسی افسر کے حکم کا انکار نہ کرنا۔ اور کبھی خدمت سلسلہ میں پیٹھ نہ دکھانا......!

یہ دعا اور ہدایت لے کر والدین کا اکلوتا فرزند یہاں پہنچا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد فسادات شروع ہو گئے۔ جن کی زد سے قادیان بھی نہ بچ سکا۔ بیرونی محلے خالی ہو چکے تھے۔ اور شہر کی اندرونی آبادی بھی خطرے میں تھی۔ مسجد اقصیٰ سے جانب غرب کا محلّہ چاروں طرف سے خطرات میں گھرا ہوا تھا۔ اور بالخصوص بے بس خواتین کو نکال کر محفوظ مقام پر پہنچانے کا کوئی انتظام نہ تھا۔ سوچ سوچ کر آخر یہ انتظام کیا گیا کہ مسجد اقصیٰ کے شمال مغربی کونے پر مؤذن کے کوارٹر کی دیوار پر لمبے تختے رکھے جائیں۔ اور ادھر گلی کے اس پار والے مکان کی منڈیر پر۔ اور اس طرح گھری ہوئی خواتین کو مسجد اقصیٰ میں لے آیا جائے جو ادھر ایک مکان میں محصور تھیں۔

چنانچہ اسی ڈیوٹی پر میاں غلام محمد صاحب کو مامور کیا گیا تھا جو سیالکوٹ شہر کے ایک مخلص غریب احمدی مستری غلام قادر صاحب کا اکلوتا فرزند تھا۔ میاں غلام محمد نے جو ایک مخلص خوبرو

نوجوان تھا اور بڑے دل گردے کا مالک تھا عین خطرے کے موقعہ پر جبکہ ایک طرف سے گولیاں چل رہی تھیں یہ فرض انجام دینا شروع کیا۔اور بڑی ہمت وجرأت کے ساتھ خواتین کو کھینچ کھینچ کر اور تھام تھام کر مسجد اقصیٰ کی طرف اتارنا شروع کیا۔گولیاں متواتر چلتی رہیں۔اور وہ موت کے اندیشہ سے بے نیاز ہو کر ''بیٹا! پیٹھ نہ دکھانا'' پر عمل کرتا رہا۔آخر ایک گولی موت کا پیغام لئے اس کے سینے میں پیوست ہوگئی۔اور وہ شہید ہو کر وہیں ڈھیر ہوگیا۔اور اپنے نام کو تاریخ احمدیت میں ایک خاص مقام دے گیا۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است برجریدہ عالم دوام ما

یہ سخت خطرے کے ایام تھے۔کرفیو لگا ہوا تھا۔اور نعش کو بہشتی مقبرہ میں لے جا کر دفن کرنا ممکن نہ تھا۔چنانچہ مرحوم کو مسجد اقصےٰ سے جانب شرق (دفاتر صدر انجمن احمدیہ کے جانب جنوب) سپرد خدا کر دیا گیا۔

بعد ازاں ۵۹ء میں سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی خاص اجازت سے مرحوم کی نعش (جس کی محض ہڈیاں رہ گئی تھیں) وہاں سے نکال کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن کر دی گئی۔مرحوم موصی نہ تھا لیکن مرحوم کی اس عظیم الشان خدمت کو حضور انور ایدہ اللہ تعالیٰ نے نوازا اور مرحوم نے بہشتی مقبرہ میں جگہ پائی۔اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور اس کے والدین کا ہمیشہ حافظ وناصر رہے جنہوں نے قربان گاہ دین پر اکلوتے فرزند کو قربان کر دیا تھا۔

(بدر ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۳ء)

مکرم میاں سلطان احمد صاحب مرحوم کھاریاں

آج میرا خامہ خونچکاں کیوں ہے۔میری یاد نے میرے دل کی رگوں کو اپنی مٹھی میں لے کر کیوں بھینچ دیا ہے۔میرا تصور کیوں مضمحل ہو رہا ہے۔میرے افق تخیل پر غم کی گھٹائیں کیوں چھا

گئی ہیں......!!

آج سے ٹھیک تیرہ سال قبل قادیان کے درویش ایک معمول کے مطابق سو کر اٹھے تو ایک بیحد غمناک صبح ان کا انتظار کر رہی تھی۔جس نے یہ دردناک خبر سنائی کہ ہمارا پیارا بھائی سلطان احمد اچانک موت کی آغوش میں پناہ لے چکا ہے۔کسی کو یقین نہ آتا تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے۔کیونکہ تین روز قبل وہ بالکل تندرست وتوانا تھا۔شب درمیاں میں کیا ہوا!؟

مگر غم اور افسوس کرنے سے کبھی موت جیسی اٹل حقیقتیں بھی بدلا کرتی ہیں؟ جو ہونا تھا ہو چکا تھا۔اس خوبرو ۲۳ سالہ مخلص نوجوان درویش کی اچانک وفات سے جو زخم دلوں پر لگنا تھا وہ لگ چکا تھا۔درویش مجسم حیرت وغم بنے اُمڈ پڑے اور احمدیہ ہسپتال میں جمع ہونے شروع ہوگئے۔جہاں ہمارے پیارے بھائی کی جوان تندرست نعش رکھی ہوئی تھی۔

ان ایام میں سیدنا حضرت امیر المومنین ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں ہمارے اکثر درویش بھائی ہر سوموار اور جمعرات کو نفلی روزے رکھا کرتے تھے اور مرحوم اس کا بہت زیادہ پابند تھا۔ایک رات سحری کے وقت مرحوم جب روزہ رکھنے کے لئے اٹھا تو کافی دیر ہو چکی تھی۔اور صبح کی اذان میں صرف چند منٹ باقی تھے۔لیکن مرحوم نے بڑے تعہد سے نفلی روزہ رکھنا اپنے اوپر واجب قرار دے رکھا تھا۔چنانچہ اور تو کوئی انتظام نہ ہو سکا۔رات کی رکھی ہوئی ایک باسی سوکھی روٹی مل گئی جسے جلدی جلدی کھا کر مرحوم نے پانی پی لیا۔چنانچہ یہی باسی روٹی موت کا پیغام بن کر مرحوم کے معدے میں چلی گئی۔اور صبح ہوتے ہوتے مرحوم کے پیٹ میں نہایت شدید درد اٹھا جسے باوجود صحتمند اور نوجوان اور صابر ہونے کے مرحوم بڑی مشکل سے برداشت کرتا رہا۔شدید قسم کی قبض تھی جو جلاب اور انیمہ کے باوجود کھلنے میں نہ آئی۔کافی توجہ سے علاج معالجہ ہوا۔لیکن مرحوم اس اچانک مرض سے جانبر نہ ہو سکا۔اور علاج تو امراض پر کامیاب ہوا کرتا ہے نہ کہ موت پر! چنانچہ قضا وقدر کے کارکنان ہمارا یہ پیارا بھائی ہم سے چھین کر لے گئے۔اور تمام درویش غم والم میں ڈوب گئے۔

سلطان احمد مرحوم' میاں محمد بخش صاحب کشمیری احمدی ساکن کھاریاں ضلع گجرات کا فرزند تھا۔کھاریاں کا یہ کشمیری خاندان بڑا ہی مخلص خاندان ہے اور سلسلہ عالیہ کے لئے ہر میدان میں

قربانیاں پیش کرنے والا ہے۔ چنانچہ اس مخلص خاندان نے درویشی میں بھی اپنا حصہ ڈالا۔ اور میاں محمد بخش صاحب نے اپنا ہونہار نوجوان فرزند قادیان بھجوا دیا۔ جسے درویشی کی سعادت حاصل ہوئی اور یوں اس کشمیری خاندان کی قربانی بارگاہ الٰہی میں قبول ہوگئی۔ میاں محمد بخش صاحب کے اور بھی بیٹے تھے۔ مگر اس زمانہ میں وہ بہت ہی چھوٹی عمروں کے تھے۔ صرف یہی بیٹا جوان تھا جسے بوڑھے باپ نے قادیان کے سپرد کر دیا تھا۔ قارئین اندازہ فرما سکتے ہیں کہ بوڑھے باپ کو اپنے نوجوان بیٹے کی وفات سے کس قدر صدمہ ہوا ہوگا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں صبر کی توفیق بخشی اور وہ راضی برضائے الٰہی ہوگئے۔

مرحوم بڑا ہی نیک اور فرمانبردار اور مخلص نوجوان تھا۔ اور ان ایام میں دفتر زائرین میں کام کرتا تھا۔ ۲۹/۸/۴۹ کو وفات پائی۔ اور موصی ہونے کی وجہ سے بہشتی مقبرہ کے قطعہ ۸ میں سپرد خدا کیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

محترم میاں شیر محمد صاحب پونچھی!

گلدستہ ساز کی گلدستہ سازی دیکھئے کہاں کہاں سے اور کس کس رنگ کے پھول لا کر اس میں ٹانکے ہیں۔ یہ تنوع دیکھئے اور یہ رنگ برنگی دیکھئے۔

یہ ہیں ایک نیم گلابی پھول ہمارے بھائی میاں شیر محمد صاحب پونچھی مرحوم۔ اصل وطن پونچھ تھا۔ اور تقسیم ملک سے قبل ہی سے قادیان میں مقیم تھے۔ تقسیم کے بعد خدمت مرکز کی سعادت حاصل کرنے کے لئے قادیان میں ٹھہر گئے۔ نہایت سادہ لوح خاموش طبیعت اور بے ضرر انسان تھے۔ چھوٹا قد۔ دوہرا بدن۔ رنگ سرخ و سپید۔ چونکہ پہاڑی آدمی تھے۔ اس لئے پہاڑی طرز کا لباس پہنتے تھے۔ ان پڑھ تھے صرف دستخط کر سکتے تھے۔ دفاتر میں ڈاک کی تقسیم کا کام کرتے تھے۔ ڈاک کی تقسیم کے سلسلہ میں ایک خاص زبان استعمال کرتے تھے۔ اور وہ زبان بقول راقم ''ملکوتی زبان'' تھی۔ انہوں نے مختلف دفاتر کے لئے مختلف نشانیاں بنا رکھی تھیں۔ جنہیں حروف کہنا مشکل ہے۔ جس وقت ڈاک ان کے حوالے کی جاتی تو محرر ڈاک کو

پھیپھڑوں کا زور لگا کر ایک بیان دینا پڑتا تھا جسے آس پاس کے تمام دفاتر سنتے تھے۔ کیونکہ مرحوم بہرے تھے۔ اب محرر ڈاک زور زور سے بتا رہا ہے کہ یہ چٹھی نظارت علیا کی ہے یہ چٹھی بیت المال کی ہے وغیرہ۔ اور مرحوم خاص اپنی ملکوتی زبان میں پنسل کے ساتھ ہر چٹھی پر نشان لگاتے جا رہے ہیں۔ سب نشان لگا کر وہ ڈاک تقسیم کرنے روانہ ہو جاتے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ ڈاک کی تقسیم میں غلطی نہ کرتے تھے۔ بلکہ اپنے لگائے ہوئے نشانوں کے مطابق صحیح تقسیم کرتے تھے۔ ان کے نشانات حروف اور لکیروں کے بین بین کوئی چیز ہوتی تھی۔

مرحوم چونکہ پہاڑی علاقے کے تھے اس لئے بکریاں پالنے کا خاص شوق تھا۔ اپنی ساری درویشی میں تین بکریاں ہمیشہ رکھیں۔ اور دفتری اوقات کے بعد ان کو چرانے لے جاتے۔ گو اس میں مرحوم کو کوئی نفع کبھی نہیں ہوا۔ لیکن ایک شغل یا عادت کے طور پر بکریاں ضرور رکھتے تھے۔

مرحوم کو یہ شرف بھی حاصل ہوا کہ وہ دو بھائی بطور درویش یہاں رہتے تھے۔ مرحوم کے دوسرے بھائی میاں نور محمد صاحب پونچھی ہیں۔ جو اس وقت ہمارے احمدیہ ہسپتال میں مددگار کارکن کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں اپنے بھائی کی وفات پر بہت صدمہ ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ صبر بخشے اور حافظ و ناصر رہے۔

مرحوم کے گلے میں سرطان ایک لمبے عرصہ سے تھا۔ اور پہلے تو بے ضرر تھا۔ لیکن گزشتہ سال سے بہت بڑھ گیا تھا۔ اور گلے کی رگیں پھولنے لگی تھیں۔ چنانچہ اس کے اپریشن کے لئے مرحوم پاکستان گئے اور میو ہسپتال میں داخلہ لے کر اپریشن کروایا۔ لیکن افسوس کہ سرطان کافی پھیل گیا تھا۔ اور اپریشن کامیاب نہ ہو سکا۔ اور ہمارا یہ بھائی ۱۹/۶/۶۲ کو میو ہسپتال لاہور میں فوت ہو گیا۔ اور نعش ربوہ لے جا کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن کی گئی۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

محترم میاں مولا بخش صاحب باورچی

یہ دیکھئے ایک اور خوشنما رنگ کا پھول میاں مولا بخش صاحب باورچی تقسیم ملک کے بعد ہر قسم کے ہنرمند درویش مقیم رہے جو خدا کے فضل سے اپنے اپنے پیشوں کے ماہر تھے۔ چنانچہ میاں مولا بخش

صاحب ولد خیرات اللہ صاحب باورچی جو یو پی کے رہنے والے تھے ایک لمبی مدت سے لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں باورچی تھے اور اپنے فن کے استاد تھے بھی یہیں رہ گئے تھے۔ان کا اپنا مکان احمدیہ محلہ میں لنگر خانہ سے قریب ڈھاب کے کنارے پر تھا۔اسی میں رہتے تھے۔انگریزی اور دیسی ہر قسم کے کھانے بڑی مہارت اور چابکدستی سے تیار کرتے تھے۔اور چونکہ اپنے فن سے محبت رکھتے تھے اور اسی فن میں ان کی ساری عمر گزری تھی اس لئے اپنے فن کے مختلف واقعات بیان کیا کرتے تھے۔تقسیم ملک کے بعد محترم چودھری محمد ظفر اللہ خان صاحب والی کوٹھی میں جو علاقہ مجسٹریٹ قیام فرما تھے' ان کے ہاں اکثر جاتے تھے۔اور ان کے بچوں کیلئے کیک بسکٹ وغیرہ تیار کر کے دیا کرتے تھے۔مجسٹریٹ سردار امولک سنگھ صاحب بھی ان کی قدر کرتے تھے اور ان کے بڑھاپے کی وجہ سے انہیں عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

نماز روزہ کے بڑے پابند تھے۔بالخصوص سحر خیزی تو ان کا غیر منقطع معمول تھا۔اور تہجد کیلئے نہ صرف خود اٹھتے تھے۔بلکہ مسجد مبارک جانے سے قبل سارے احمدیہ محلہ کا ایک چکر لگاتے تھے۔اور درویشوں کو تہجد کے لئے بیدار کرتے تھے۔اور ساتھ ساتھ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے اشعار بلند آواز اور اپنی مخصوص لے میں پڑھتے جاتے تھے۔بڑھاپے کی وجہ سے تین یا ساڑھے تین فٹ لمبا بانس کا موٹا عصا ہاتھ میں رکھتے تھے اور تہجد کے وقت محلے کا چکر لگاتے ہوئے۔اپنا عصا معمول سے ذرا سختی کے ساتھ زمین پر مارتے جاتے تھے۔اور اس وقت ان کے شعر پڑھنے کی لے میں ایک کیف اور سوز ہوتا تھا۔اور یہ ایک دو روز کی بات نہ تھی۔بلکہ پورے سات سال ان کا یہی معمول رہا۔اور مرض الموت میں جا کر ختم ہوا۔جبکہ وہ چارپائی کے حلیف ہو کر رہ گئے تھے۔

تقسیم ملک کے وقت ان کی عمر ۷۳ سال کی تھی۔لیکن ابھی تک صدر انجمن احمدیہ کے کارکن تھے۔اور نوجوانوں کی طرح لنگر خانہ میں خدمات انجام دیتے تھے۔مگر جب کمزوری زیادہ ہوگئی تو انہیں پنشن مل گئی۔آخر ۸۰ سال کی ایک لمبی عمر طبعی پا کر ۲۴/۷/۵۴ کو وفات پا گئے۔اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ ۸ میں دفن ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۱۱ اکتوبر ۱۹۶۲ء)

مکرم میاں مجید احمد صاحب ڈرائیور مرحوم

گلدستہ میں کچھ پھول تو ایسے ہوتے ہیں جو بڑی دیر تک اپنی تروتازگی اور حسن رنگ و بو سے باصرہ نوازی کرتے رہتے ہیں۔لیکن ان میں سے کچھ نرم و نازک پھول ایسے بھی ہوتے ہیں جو لمحاتی جانفزائی کر کے پژمردہ ہو جاتے ہیں۔انہی مؤخر الذکر قسم کے پھولوں میں سے ایک ہمارے عزیز اور نوجوان بھائی مجید احمد صاحب ڈرائیور مرحوم تھے جو عالم شباب میں جادہ آخرت پر گامزن ہو کر ہم سے جدا ہو گئے۔اگر ہم ''در جوانی توبہ کردن'' کا صحیح تصور اپنے ذہن میں لانا چاہیں تو مجید احمد صاحب کا جوان' شگفتہ' سنجیدہ اور اخلاق و اخلاص کا مجسم ہیولیٰ نظروں کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔مرحوم تقسیم ملک سے قبل سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانی ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز کی ایک موٹر کار کے ڈرائیور تھے۔اور تقسیم کے بعد درویشی کی سعادت سے مسعود ہوئے۔

مرحوم نہایت نیک نفس' مخلص اور نماز روزہ کے پابند نوجوان تھے۔اور اطاعت و فرمانبرداری ان کا ایک خاص شعار تھی۔مضبوط اور گٹھیلا جسم تھا۔اور ساتھ ہی محنتی اور جفاکش بھی تھے۔چنانچہ تقسیم ملک کے بعد جب بہشتی مقبرہ کی بیرونی خام چاردیواری تعمیر ہوئی تو اس میں انہوں نے نمایاں کام کیا۔اور نبرد محنت میں اپنے ساتھیوں سے بازی لے جاتے رہے۔یہ وہ ایام تھے کہ درویشی کا ابتدائی دور تھا۔جس میں مشکلات بھی تھیں اور پریشانیاں بھی۔مرحوم چونکہ محنت زیادہ کرتے تھے اور خوراک کا مسئلہ بھی ان ایام میں پیچیدہ تھا۔اس لئے مرحوم کے ہاضمہ پر اثر پڑا۔اور پھر انتڑیاں متورم ہو گئیں۔کافی علاج معالجہ ہوتا رہا۔مگر موت کے علاج کے لئے آج تک تو کوئی ڈاکٹر پیدا نہیں ہوا۔چنانچہ اسی مرض سے مرحوم عین عالم جوانی میں جبکہ مرحوم کی عمر بمشکل ۲۵-۲۶ سال کی تھی۔۴/۱۰/۴۹ کو وفات پا کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔مرحوم اپنے پیچھے ایک بیوی اور ایک بچی چھوڑ گئے۔مرحوم کا اصل وطن شادیوال ضلع گجرات تھا۔

یہاں اس امر کا ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم اپنی درویشی کے تین سالہ دور میں جبکہ ہمارے تمام درویش بھائی یہاں مجرد تھے۔اور سب کے بیوی بچے اور دوسرے رشتہ دار پاکستان جا چکے تھے......خاص طور پر اپنی بیوی اور بچی کی جدائی میں پریشان رہتے تھے۔یہ ایک

انسانی طبعی تقاضا تھا۔ جو صرف مرحوم سے مختص نہ تھا۔ بلکہ اکثر درویشوں کے حالات اسی قسم کے تھے اور حقیقتاً یہ درد بڑا ہی صبر آزما تھا۔ جس کی تفصیل بڑی طویل بھی ہے اور دردناک بھی۔ لیکن یہ تفصیل کسی نوعیت کی بھی ہو۔ یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل اور احسان ہے کہ اس نے درویشوں کو اس امتحان میں سے کامیابی کے ساتھ گزرنے کی توفیق بخشی۔ اور وہ اپنے تمام مادی جذبات کو کچل کر اس قربان گاہ عشق میں قدم آگے بڑھاتے چلے گئے اور آج بھی جبکہ درویشی کے پندرہ سال ہم پر گزر چکے ہیں جب دماغ کا شعور اپنے پٹ کھول کر پرانی یادوں کو سامنے لاتا ہے تو ایک طرف ان تلخیوں کو یاد کر کے دل میں اک ہوک اٹھتی ہے اور دوسری طرف دل بارگاہ الٰہی کی چوکھٹ پر سجدہ ریز ہوتا ہے کہ اس نے صبر وثبات کی توفیق دی۔ الحمد للہ

(بدر ۲۷ ستمبر ۱۹۶۲ء)

محترم صوفی علی محمد صاحب نارووالی مرحوم

وہ گلدستہ ہی کیا جس میں انواع واقسام کے پھول نہ ہوں۔ ایک اور رنگ دیکھئے۔ یہ ہمارے ایک معمر بزرگ بھائی صوفی علی محمد صاحب نارووالی ہیں۔ مرحوم ایک خاص طبیعت کے مالک تھے۔ قرآن کریم کی تلاوت کرنا ان کا ہر وقت کا محبوب مشغلہ تھا یا کہ ان کی عادت ثانیہ تھی یا اسے عشق قرآن کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اور صرف خود پڑھنے کا شوق نہ تھا بلکہ دوسروں کو بھی ناظرہ اور باترجمہ پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اور درویشوں کے پاس خود پہنچ کر پڑھاتے تھے۔ چنانچہ ہمارے بہت سے درویش بھائیوں نے ان سے قرآن شریف پڑھا اور ترجمہ سیکھا۔ مرحوم کو وظیفہ بھی ملتا تھا۔ اور معمولی تجارت کا کام بھی کرتے تھے۔ مثلاً منڈی سے پھل لے آتے اور اپنے کمرے میں (حضرت سید محمد سرور شاہ صاحب رضی اللہ عنہ کے مکان کی بیٹھک متصل زنانہ جلسہ گاہ) پھل کی ٹوکری سامنے رکھ کر قرآن کریم ہاتھ میں لئے دن بھر بلند آواز سے تلاوت کرتے رہتے اور قرآن پڑھانے کا یہ شوق ہی تھا کہ مرحوم نے بٹالہ میں کوئی علم دوست ہندو فیملی بھی تلاش کر لی۔ جس کے بچوں کو قرآن کریم پڑھانے کے لئے قادیان سے جایا کرتے تھے۔ اور بعض اوقات کئی کئی دن انہی کے ہاں قیام کرتے۔

مرحوم چونکہ ایک ناصح بزرگ تھے اسی لئے بلا امتیاز مذہب ہر ملنے والے کو نصیحتیں کرتے رہتے تھے جو ان کی لمبی عمر کے تجربہ کا نچوڑ ہوتی تھیں اور نصیحتوں کے ساتھ برمحل اور پرمذاق مثالیں بھی دیتے تھے۔ نمازوں اور روزوں اور تہجد کے پابند تھے اور لوٹے، مصلے اور مسجد کے ساتھ گہرا رشتہ تھا۔

مرحوم اکثر سنجیدہ رہتے تھے۔ لیکن جب شگفتگی پر آتے تو ان کی شگفتگی کو برداشت کر جانا بھی بڑے دل گردے کا کام تھا۔ ایسے ایسے لطیفے اور پھبتیاں ہوتیں کہ ماحول کی افسردگی ہوا ہو جاتی......!!

بات کو ایک خاص اسلوب اور الفاظ میں ڈھالنے کا ڈھنگ آتا تھا۔ چنانچہ ایک بار کسی معاملہ کے متعلق حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب سلمہ اللہ سے بات کر رہے تھے۔ راقم بھی پاس بیٹھا تھا۔ کہنے لگے:

> ''ہم خدا کے فضل سے حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے جاں نثار اور وفادار خادم ہیں۔ اور وفاداری کے عہد کو نبھائیں گے۔ حضرت موسیٰؑ کی قوم کی طرح یہ نہیں کہیں گے کہ جا تو اور تیرا رب جا کر لڑو اور جب فتح کر چکو تو تین پیسے کا کارڈ لکھ دینا۔!''[1]

آخری ایام میں کمزوری صحت کی وجہ سے پاؤں متورم ہو گئے تھے اور بدقت چلتے پھرتے تھے۔ اسی حالت میں پاسپورٹ پر پاکستان گئے وہاں بیماری نے شدت اختیار کر لی اور آخر 5 مئی 61ء کو ربوہ میں فوت ہو کر بہشتی مقبرہ ربوہ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

مرحوم میانہ قامت سانولے رنگ کے تھے۔ اچھی صحت کی حالت میں بھی نہایت آہستہ چلتے تھے۔ شاید ولا تمش فی الارض مرحاً پر عمل کرتے ہوں۔ مرحوم قادیان کے پرانے باشندے تھے۔ محترم مولوی نور الحق صاحب انور فاضل مبلغ افریقہ، مرحوم کے فرزند ہیں۔

(بدر ۲۰ ستمبر ۱۹۶۲ء)

---

[1] اس زمانہ میں پوسٹ کارڈ تین پیسے میں ملتا تھا۔

محترم عبدالاحد خان صاحب افغان مرحوم

کوئی مالی جتنا زیادہ تجربہ کار، جتنا زیادہ ماہر فن اور چابکدست ہوتا ہے۔ اتنا ہی زیادہ خوبصورت و دلآویز اور باصرہ نواز گلدستہ تیار کرتا ہے۔ وہ مختلف پھولوں کے متناسب اور متوازن رنگ کوملحوظ رکھ کر یوں مجتمع کرتا ہے کہ وہ ناظرین کی نگاہوں کو اپنی طرف کھینچ لیتے ہیں۔

گلشن احمدیت کے اس دور کے عظیم مالی سیدنا حضرت مصلح موعود نے ۱۹۴۷ء کے پر آشوب زمانہ میں جو گلدستہ تیار فرمایا وہ اپنی نظیر آپ ہے۔ اور ہمارے اس بے نظیر آقا کا ایک زندہ جاوید شاہکار ہے۔ ہمارے اس محبوب محسن اعظم نے کن کن رنگوں اور خاصیتوں کوملحوظ رکھ کر اپنی دوربین روحانی نگاہوں سے ایک انتخاب فرمایا اور ۳۱۳ پھول ایک روحانی دھاگہ میں مضبوطی اور خوبصورتی سے باندھے جس کا حیرت انگیز امتزاج رنگ و بو تھا۔

دیکھئے نا! قدرت اس خوشنما پھول کو اس گلدستہ میں سجانے کے لئے کہاں سے لے آئی تھی۔ اس تاریخی سرزمین سے جو آج بھی احمدیت کے بیج کے لئے سنگلاخ ہے۔ لیکن ایک اور نقطہ نظر سے قدرت نے اسے ایک امتیاز بھی بخشا ہے۔ یوں تو احمدیت نام ہی متواتر اور مسلسل قربانیوں کا ہے۔ لیکن سرزمین کابل میں فرزندان احمدیت بالخصوص حضرت صاحب زادہ سید عبداللطیف صاحب شہیدؓ نے جو قربانی اپنی زبردست قوت ایمانی کے بل پر دی وہ بے مثال بھی ہے، اور زندہ جاوید بھی۔ ہمارے بزرگ درویش بھائی مکرم عبدالاحد خان صاحب مرحوم اسی سرزمین کابل (افغانستان) کے رہنے والے تھے، جہاں فرزندان احمدیت کی وفا کا سخت امتحان لیا گیا تھا۔ اور اپنی جانوں کی قربانی دے کر انہوں نے سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی خوشنودی اور اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کی تھی۔ اور اپنی قوت ایمانی اور ثابت قدمی سے ثابت کر گئے کہ صدق و وفا ہی ایثار کا وہ جذبہ ہے کہ جس کی تکمیل پر قومیں فخر کیا کرتی ہیں۔

عبدالاحد خان صاحب مرحوم ۱۲ سال کی عمر میں اپنے گاؤں کتاخیل سے جو کابل سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے خلافت اولیٰ کے زمانہ میں ۱۹۰۹ء میں قادیان آئے۔ اور مہمان خانہ کے ایک کمرے میں مقیم ہوئے حضرت رسول اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک مومن اس ناپائیدار دنیا

میں یوں زندگی گذارتا ہے جیسے سرائے میں کوئی مسافر شب بسری کیلئے ٹھہر جائے۔ خان صاحب نے گویا معنوی رنگ میں اس پر عمل کیا خان صاحب تعلیم یافتہ نہ تھے۔ مگر قادیان کی مسلسل رہائش اور علمی صحبتوں میں رہ کر پڑھنا سیکھ لیا تھا۔

آپ ساری عمر سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے ساتھ بطور باڈی گارڈ خدمت بجالاتے رہے۔ اپنے مخصوص افغانی لباس میں حضورؓ کے ہمراہ قریباً دوڑنے کے انداز میں چلا کرتے اور اسی حالت میں حضرت مصلح موعودؓ کے ساتھ ان کے پرخلوص محبت کا جذبہ ان کے چہرے پر عیاں ہوتا تھا۔ یوں تو مرحوم کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے سارے خاندان سے محبت تھی۔ لیکن حضرت مصلح موعودؓ کے ساتھ محبت وعقیدت اور خلوص وفدائیت کا رنگ بالکل نرالا تھا۔ ملک کی تقسیم کے بعد حضرت مصلح موعودؓ کی جدائی میں اداس رہتے۔

مرحوم کا ایک قابل فخر کارنامہ یہ ہے کہ جب سیدنا حضرت مصلح موعودؓ نے کتاب ''دعوۃ الامیر'' لکھی اور اس کا فارسی ترجمہ بھی شائع ہوا تو شاہ افغانستان کو فارسی نسخہ پہنچانے کے لئے مرحوم کابل گئے تھے جہاں محمود طرزی صاحب وزیر خارجہ افغانستان کے ذریعہ وہ کتاب شاہ افغانستان کو پہنچائی۔

مرحوم خان صاحب کو حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے منظوم فارسی کلام سے عشق تھا۔ مہمان خانہ کے صحن میں چارپائی پر بیٹھے بلند آواز میں تلاوت قرآن کریم کیا کرتے یا اپنی مخصوص افغانی طرز کے ساتھ حضورؑ کے فارسی اشعار پڑھا کرتے۔

مرحوم بے حد سادہ طبع اور درویش صفت تھے۔ اور دور درویشی میں تو ان کی درویشی ڈبل ہو گئی تھی۔ آپ کی شادی بڑھاپے کی عمر میں ہوئی لیکن کوئی اولاد نہ ہوئی۔ آخری عمر میں بینائی سے بھی محروم ہو گئے تھے۔ اور چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے تھے۔ قریباً ستر سال کی عمر میں ہمارے اس درویش بھائی نے ۱۲ اگست ۱۹۶۸ء کو داعی اجل کو لبیک کہا اور بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔ مرحوم کے والد کا نام مکرم فتح محمد خان صاحب تھا۔ قد درمیانہ اور جسم بھاری تھا۔ احمدیت پر پختہ ایمان اور خلافت حقہ احمدیہ کے ساتھ بڑی ہی گہری وابستگی اور عقیدت تھی۔ بالخصوص سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کے ساتھ عشق رکھتے تھے۔

اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے۔

(بدر ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء)

محترم بابا محمد دین صاحب مرحوم

ہمارے ایک اور بزرگ درویش بھائی محترم بابا محمد دین صاحب تھے۔ ابتدائے درویشی سے ہی وہ کافی معمر تھے اور دنوں، مہینوں اور سالوں کے بوجھ نے ان کی کمر کو خمیدہ کر رکھا تھا۔ لیکن اس ضعف پیری اور خمیدگیٔ کمر کے باوجود وہ اس قدر باہمت واقع ہوئے تھے کہ درویشی کے ۲۱ سالہ طویل دور میں اپنے ہاتھ سے اپنا سارا کام کرتے رہے۔ اور اپنی روزی خود کماتے رہے۔ اب تو مشینی دور نے قوائے انسانی کو مضمحل اور بے کار کر کے رکھ دیا ہے اور لوگ بہت زیادہ آرام طلب ہو چکے ہیں۔ لیکن پرانے زمانے کے لوگوں کے جسم ہی مشینوں کا سا کام کرتے تھے۔ انہی میں سے ایک بابا صاحب موصوف بھی تھے۔ آپ کو بھینس پالنے کا شوق تھا۔ چنانچہ اپنی ساری درویشی میں بھینس پالنے کا شوق اور شغل جاری رکھا۔ دن بھر کھرپا ہاتھ میں لئے بہشتی مقبرہ کی کسی سڑک پر گھاس کھودتے نظر آتے۔ یہی وہ سخت قسم کی محنت اور ورزش تھی جو بڑھاپے کے باوجود ان کی صحت کی ضامن بنی رہی اور ایک غیور انسان کی طرح انہیں کسی کا محتاج ہونے نہ دیا۔ چونکہ باہمت انسان تھے۔ اس لئے قدرت نے پسند نہ کیا کہ جواں ہمت بوڑھا کسی مرض میں مبتلا ہو کر چارپائی پر پڑ جائے۔ اور کھانے پانی کے لئے کسی کا محتاج ہو جائے۔ چنانچہ ۶۸/۷/۷ کی ایک دوپہر کو ان کی وفات اس شان سے واقع ہوئی کہ جھلستی دوپہر میں گھاس کھود کر واپس آئے اور اپنے کوارٹر کی ڈیوڑھی میں اسی گھاس کی گٹھڑی سے پیٹھ لگا کر نیم دراز ہو گئے اور اسی حالت میں ان کی روح قفس عنصری سے آزاد ہو کر اپنے مولیٰ کے ہاں پہنچ گئی۔ اپنا کھانا تو اپنے ہاتھ سے پکاتے ہی تھے۔ لیکن ہمت کی انتہاء یہ تھی کہ اپنے رہائشی مکان میں ہر قسم کی تعمیر کا کام بھی اکیلے اور اپنے ہاتھ سے کر لیتے تھے۔ اور حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ابھی دو سال قبل کی بات ہے اپنی ضعیفی اور خمیدہ کمر کے باوجود اپنی ڈیوڑھی کی چھت خود اتاری اور خود ہی گارا وغیرہ بنا کر خود ٹائلیں چھت پر پہنچائیں اور یوں ''ہمت مرداں مدد خدا'' کا مظاہرہ کیا۔ بابا جی کی جنون آسا ہمت انہیں ہر وقت

متحرک رکھتی تھی۔ بابا جی مرحوم بے حد سادہ اور خاموش طبع درویش تھے۔ بڑے ہی صبر و سکون کے ساتھ درویشی کے دور کو گزارا۔ سفید ریش بابا جی منحنی قد و قامت اور سرخ و سپید رنگت رکھتے تھے۔ مرحوم کے والد کا نام بھولا تھا۔ ان کا اصل وطن بدو کے ضلع گوجرانوالہ پاکستان تھا۔ وفات کے وقت ان کی عمر قریباً ۸۵ سال تھی۔ آپ موصی تھے اس لئے آپ کی تدفین بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں ہوئی۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(بدر ۱۷ اپریل ۱۹۶۹ء)

محترم حکیم عبدالرحیم صاحب مرحوم

آپ حیدرآباد ریاست کپورتھلہ کے رہنے والے تھے۔ لیکن لمبے عرصہ سے ہجرت کر کے قادیان آ گئے تھے۔ اور محلہ مسجد فضل میں اپنا مکان بنا لیا تھا۔ اور دواخانہ بھی بنام ''فیض عام'' کھول لیا تھا۔ طبابت سے اچھی گزر بسر ہوتی تھی۔ خاموش طبع، سنجیدہ اور دعا گو بزرگ تھے۔ قادیان آنے سے قبل آپ نے کچھ عرصہ پرانی انارکلی لاہور میں دواخانہ جاری کیا تھا۔ اور کچھ عرصہ ایبٹ آباد میں بھی طبابت کرتے رہے۔ پھر کچھ عرصہ تلاش روزگار میں برما میں رہے۔ درویشی کے چودہ سال بڑی سنجیدگی، فرمانبرداری اور وقار کے ساتھ گزارے اور ساٹھ سال کی عمر میں ۱۰ جون ۱۹۶۱ء کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔ آپ موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔ مرحوم کے ایک فرزند فضل محمود صاحب سرگودھا میں ہیں۔

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۲ء)

محترم میاں فضل دین صاحب ماشکی مرحوم

ہمارے معمر درویش بھائی میاں فضل دین صاحب ماشکی ولد میاں نور محمد صاحب قادیان کے قدیمی باشندہ تھے۔ اور تقسیم ملک کے بعد اپنے بھائی میاں محمد عبداللہ صاحب ماشکی سمیت خدمت مرکز کے جذبہ کے ساتھ یہیں ٹھہر گئے تھے۔ اور بال بچوں کو پاکستان بھجوا دیا تھا۔ اس

طرح قیام قادیان کو پاکستان جانے پر ترجیح دے کر خلوص و فدائیت کا اعلیٰ نمونہ دکھایا۔ خاموش طبع اور غریب مزاج انسان تھے۔ کچھ عرصہ تک قادیان کی میونسپل کمیٹی میں ماشکی کے طور پر کام کرتے رہے۔ اور پھر لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام میں سقہ کی ڈیوٹی پر مامور ہوئے۔ عام صحت بہت اچھی تھی۔ اور ہمت کے ساتھ کام کرتے تھے۔ ایک شام جبکہ وہ مہمان خانہ کے سامنے سے لنگر خانہ کی طرف جا رہے تھے تو کوارٹر مہمان خانہ کے سامنے اچانک چکرا کر گر گئے۔ اور حرکت قلب بند ہو جانے سے، قبل اس کے کہ کوئی طبی امداد پہنچتی جسم و جان کا رشتہ منقطع ہو گیا۔ مرحوم موصی تھے بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔ وفات ۱۸ جنوری سن ۱۹۵۳ء کو ہوئی۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم کی بیوہ اور چار بچے ربوہ میں ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کا حافظ و ناصر رہے۔

(بدر ۶ دسمبر ۱۹۶۳ء)

محترم عبدالرحیم صاحب ملکانہ مرحوم

ایک بار تو اجل کی آنکھوں میں بھی آنسو تیر گئے ہوں گے۔ اور ایک بار تو سنگدل موت کا دل بھی دہل گیا ہو گا جب اس نے ہمارے بھائی عبدالرحیم صاحب ملکانہ کے طائر روح کی گردن اپنے چنگل میں لی ہو گی۔ بعض حادثات اتنے غیر معمولی ہوتے ہیں اور پھر اتنے اچانک کہ ان کے پس پردہ قدرت کا ایک زبردست ہاتھ کام کرتا ہوا صاف نظر آ جاتا ہے۔ اور بعض سانحات اس قدر غیر متوقع طور پر ظہور پذیر ہوتے ہیں کہ اس سانحہ کی زد میں آنے والے ہر فرد کے عزائم ایک چھناکے کے ساتھ ٹوٹ کر درس حسرت و عبرت بن جاتے ہیں۔ یہی اللہ تعالیٰ کی جلوہ گری ہے۔ اور یہی فوق العقل مظاہر قدرت ہیں جو ایک آنی طور پر سہی مگر ایک دہریہ کو بھی خدا تعالیٰ کی قادر و توانا ہستی کا قائل بنا دیتے ہیں۔

"ابھی کل شام تو وہ صحت ور اور تندرست تھے۔" "کل عصر کے وقت تو وہ بالکل توانا تھے۔" "کل دوپہر تو وہ اچھے بھلے اپنی دوکان میں مریضوں کو دیکھ رہے تھے۔" "یہ خبر درست نہیں ہو سکتی۔" بہت سی زبانیں تھیں جنہوں نے اس اچانک حادثے کی خبر سن کر ایسے الفاظ کہے۔ ملکانہ صاحب کی وفات ایک ایسا واقعہ تھا جسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد بھی درست تسلیم کرنے

کو جی نہ چاہتا تھا۔ کچھ تو اس لئے کہ وہ کل تک قابل رشک صحت کے مالک تھے۔ اور کچھ اس لئے کہ اُن کی شخصیت اپنے محدود سے دائرہ میں ہر دل عزیز تھی۔ اُن کی وفات کی تصدیق ہوتے ہی محلہ احمدیہ کے ہر مرد و زن اور بچّے کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔

جیسا کہ جزو نام سے ظاہر ہے ملکانہ صاحب مرحوم علاقہ ملکانہ کے رہنے والے تھے۔ مگر اپنے بچپن سے ہی قادیان چلے آئے تھے۔ اور یہیں رہ کر مدرسہ احمدیہ میں تعلیم پاتے رہے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ انسپکٹر بیت المال مقرر ہوئے اور ایک عرصہ دراز تک یہ خدمت بجالاتے رہے۔ انہوں نے انسپکٹری کے فرائض اتنے خلوص اور خوش اسلوبی سے ادا کئے کہ ہندوستان بھر کی جماعتیں اُن کے اس امتیاز کا ذکر کرتی ہیں۔ میں ایک مرتبہ اُڑیسہ کے دورہ پر کیرنگ گیا تو ایک دوست کہنے لگے کہ ملکانہ صاحب اپنے فرض کی ادائیگی میں اتنے شدید ہیں کہ ہم ہل جوت کر کھیتوں میں چلے جائیں تو وہ کھیتوں میں ہمارے پاس پہنچ جاتے ہیں۔ اور جماعتی چندوں کا تقاضا کرتے ہیں۔ گو بعض لوگوں کے ساتھ ان کی جھڑپ بھی ہو جاتی ہے مگر اُن کے خلوص کے باعث ہم انہیں بہت محبّت اور عزّت سے یاد کرتے ہیں۔ ملکانہ صاحب مرحوم کی وفات کے بعد بھی خاکسار جنوبی ہند کے دورہ پر گیا تو ہر جماعت کے لوگوں نے ملکانہ صاحب کی اس خوبی کا ذکر کیا۔ بہر حال وہ اپنے فرائض کی ادائیگی میں ماہر اور پرخلوص تھے۔ جماعتی مسائل سے واقفیت اور اپنی دینداری کے باعث وہ ایک کامیاب انسپکٹر کی حیثیت سے جماعت کی خدمت کرتے رہے۔ اور آخری چند سالوں میں وہ مرکز میں ہی رہ کر نظارت علیا کے دفتر میں کام کرتے رہے اور ساتھ ہی طبابت کا کام جاری رکھا۔ طبابت بھی کامیاب تھی اسی لئے اس مہنگائی کے دور میں اپنی کثیر العیالی پر قابو پاتے رہے۔ مگر عین عالم جوانی میں بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر موت کا زبردست ہاتھ انہیں ان کے روتے بلکتے بیوی بچوں سے چھین کر لے گیا۔

۲۷ دسمبر ۱۹۶۵ء کی رات کو وہ اچانک طور پر بیمار ہوئے اور ۲۸ دسمبر کی صبح کو ان کا وجود عدم کی وسعتوں میں گم ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ مرحوم موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں ابدی نیند سو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں بلند مقام بخشے اور پسماندگان کا حافظ و ناصر رہے۔ آمین۔

(بدر ۸ جون ۱۹۶۷ء)

محترم بابا جلال الدین صاحب مرحوم

کسی سرائے میں جو لوگ شب بسری کے لئے قیام کرتے ہیں وہ عموماً ایک دوسرے سے زیادہ متعارف نہیں ہو سکتے۔ رات گزار کر صبح اپنی اپنی منزل پر روانہ ہو جاتے ہیں۔ رسول کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ تم دنیا میں اس طرح رہو جیسے کوئی مسافر سرائے میں قیام کر کے اگلے روز اپنے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے۔ اس ارشاد نبویؐ پر صحیح طور پر عمل کرنے والوں میں ہمارے ایک بزرگ درویش بابا جلال الدین صاحب بھی تھے۔ وہ بوڑھے اور دمہ کے مریض تھے۔ لڑکیوں کے سکول میں ایک معمولی سی ڈیوٹی ان کے سپرد تھی۔ یہی ان کا حلقہ تعارف تھا۔ یا نمازوں کے اوقات میں کسی مسجد کا خاموش گوشہ ان کا کنج عافیت۔ وہ اتنے خاموش طبع تھے کہ کراماً کاتبین بھی مہینوں ان کی کوئی بات ریکارڈ کرنے کے منتظر رہتے۔ وہ اپنی نیک طبع اور خدمت گزار اہلیہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں خاموش اور پرسکون اٹھارہ سالہ درویشی گزار کر ۱۹/۷/۶۹ کو سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔ اور غمگین درویشوں نے انہیں بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں پہنچا دیا۔ بابا صاحب مرحوم زندگی میں بھی عبدالرحیم صاحب ملکانہ کے ہمسایہ رہے اور فوت ہونے کے بعد بھی ان کے ہمسایہ بن گئے۔

میں جب کبھی بابا جی کی قبر پر جاتا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ بابا جی کا نطق خاموش مجھ سے استفسار کر رہا ہے کہ ''کسی درویش بھائی کو مجھ سے کسی قسم کا شکوہ تو نہیں؟'' اور میں دل میں کہتا ہوں ''بابا جی! شکوہ یہی ہے کہ آپ کی خوش بختی نے آپ کو بہشتی مقبرہ میں پہنچا دیا اور ہم پیچھے رہ گئے۔''

(بدر ۸ جون ۱۹۶۷ء)

محترم حاجی فضل محمد صاحب کپورتھلوی!

ہمارے ایک اور درویش حاجی فضل محمد صاحب کپورتھلوی تھے۔ اُن کا خمیر قدرت نے نیکی اور سادگی کے مرکب سے اٹھایا تھا۔ تقویٰ اور عزلت پسندی ان کا طرہ امتیاز تھا۔ ابتدائے درویشی میں وہ بہشتی مقبرہ میں پہرے وغیرہ کی ہلکی ڈیوٹیاں دیتے رہے۔ لیکن اپنی عمر کے اعتبار سے جب وہ چارپائی کے حلیف ہو گئے تو برسوں تک لنگر خانہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے ایک چھوٹے

سے کمرے میں مقیم رہے۔ عبادات و وظائف ہی ان کا مشغلہ تھا۔ ان کا ایک خاص وصف یہ تھا کہ بایں ضعف و ناتوانی، مقیم یا مہمان علمائے سلسلہ کے پاس پہنچ کر اُن سے خط و کتابت کر کے ایک خاص مسئلہ پر بحث کی طرح ڈالتے۔ سکھ لٹریچر سے معمولی سی واقفیت تھی۔ اور حضرت بابا نانکؒ کے کئی شبد انہیں یاد تھے۔ بالخصوص ایک حوالہ کے متعلق تو وہ برسوں احمدی اور سکھ علماء سے خط و کتابت کرتے رہے۔ یعنی ''وخت نہ پایو قادیان جے لکھن لیکھ قرآن۔'' اور یہ شوق انہیں جنون کی حد تک تھا۔ بہر حال وہ ایسے بزرگوں میں سے تھے جن کا اوڑھنا بچھونا تبلیغ احمدیت ہوتا ہے۔ اور اسے وہ اپنا مقصد زندگی بنا لیتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ سیدنا مسیح موعود علیہ السلام ایک ایسی جماعت پیدا کرنے کے لئے مبعوث ہوئے تھے جو مجنونانہ طور پر اسلام کی تبلیغ کر سکے۔ الحمدللہ کہ حضور علیہ السلام کی بعثت کا یہ مقصد سو فی صد پورا ہوا۔

اپنی عمر کے آخری سالوں میں حاجی صاحب مرحوم بہت زیادہ کمزور ہو گئے تھے۔ ضعف پیری نے انہیں چارپائی سے چپک جانے پر مجبور کر دیا۔ اور ایک مرنجاں مرنج زندگی کے ۹۴ سال گزار کر ہمارا یہ بزرگ درویش سفید براق ان سلے کپڑے پہنے ۲۶/۱۱/۶۶ کو وصال الٰہی کے لئے تیار ہو گیا۔ یہ لباس مرحوم نے دو مرتبہ زیب تن کیا۔ پہلی بار حج کے موقعہ پر کہ وہ بھی وصال الٰہی کا ایک مظہر ہوتا ہے۔ اور دوسری بار وفات کے بعد کہ وصال الٰہی حقیقت بن جاتا ہے۔ مرحوم موصی تھے مورخہ ۲۶/۱۱/۶۶ کو بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں آسودۂ خواب ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(بدر ۸ جون ۱۹۶۷ء)

مکرم مستری عبدالغفور صاحب مرحوم

اس گلشن عالم میں انواع و اقسام کے پھول اپنے اپنے مخصوص رنگ و بُو کے ساتھ کھلتے ہیں۔ اور ایک محدود عرصہ تک سیرگاہ گیتی میں حسن نظر کی تسکین کا سامان کر کے ایک عمر طبعی پا کر بہر حال وقت کی بادِ سموم کے اثرات سے مرجھا جاتے ہیں۔ قدرت کا یہ نظام اسی طرح چلتا آیا ہے اور اسی طرح چلتا رہے گا۔

تقسیم ملک کے پر آشوب زمانہ میں جب احمدیت کے دائمی مرکز قادیان کو کچھ ایسے دیوانوں کی ضرورت تھی جو اپنے تمام دنیوی علائق سے منقطع ہو کر صرف مقامات مقدسہ کی خدمت کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر کے رضائے الٰہی کو حاصل کریں، تو سیدنا حضرت مصلح موعود کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں ۳۱۳ درویشوں نے اپنے آپ کو پیش کر دیا۔ اور صدق ووفا کا وہ نمونہ دکھایا جس پر تاریخ احمدیت ہمیشہ فخر کرے گی۔

گلشن احمدؑ کے یہ پھول اپنی اپنی عمر طبعی کے مطابق زینت چمن بن کر مرجھاتے چلے جا رہے ہیں۔ اور ۳۱۳ کی تعداد گھٹ کر اب صرف ایک سو کے قریب رہ گئی ہے۔ گزشتہ تھوڑے سے عرصہ میں ہمارے چار ساتھی ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ انہی کی خدمت میں عقیدت و محبت کا ہدیہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمتوں سے نوازے۔ آمین

مضبوط پہلوانی جسم۔ سانولا رنگ۔ چہرے پر سادگی اور مسکراہٹ۔ پرخلوص اور باوفا انسان یہ تھے ہمارے درویش بھائی مستری عبدالغفور صاحب مرحوم۔ جو تقسیم ملک کے وقت مقامات مقدسہ قادیان کی خدمت کا ولولہ دل میں لئے ایک عہد استوار باندھ کر یہاں ٹھہر گئے تھے۔ اور ۲۷ سال تک اپنے عہد کو خوش اسلوبی سے نبھا کر سرخروئی کے ساتھ مورخہ ۳ اگست ۱۹۷۴ء کو اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔

مستری صاحب مرحوم کی پہلی بیوی جو تقسیم ملک سے قبل فوت ہو چکی تھی جس کے بطن سے ایک لڑکا تھا۔ جو پاکستان میں ہی رہتا تھا۔ دوسری شادی انہوں نے راٹھ۔ (یو۔پی) میں مکرم ماسٹر نثار محمد صاحب مرحوم کی ہمشیرہ فخر النساء صاحبہ سے کی۔ ان کے بطن سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔

زمانہ درویشی میں سے اکثر حصہ مرحوم نے صدر انجمن احمدیہ پر بوجھ بنے بغیر گزارا۔ وہ اپنے آبائی پیشہ یعنی لوہار کا کام کر کے گزارہ چلاتے رہے۔ ان کا بایاں ہاتھ زمانہ درویشی میں ہی ایک مشین پر کام کرتے ہوئے کٹ گیا تھا۔ انگلیاں تو جڑ گئی تھیں۔ لیکن ان میں ٹیڑھا پن آ گیا تھا۔ اس کے باوجود وہ بدستور مستری کا کام کرتے رہے۔ اور بڑی ہمت کے ساتھ اپنا گزارہ چلایا۔

بہت خاموش، نرم دل اور شریف الطبع انسان تھے۔ اگست ۷۴ء میں کوئی سخت محنت کا لوہارا

کام کرتے ہوئے شدت گرمی سے بے حال ہو کر ڈاکٹر کے پاس پہنچے، دوائی لی اور گھر چلے گئے۔ یک وقت حالت بگڑ گئی اور کوئی طبی امداد پہنچنے سے قبل ہی خدا تعالیٰ کے حضور پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔

(بدر ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ء)

محترم حضرت بھائی شیر محمد صاحب قادیانی

زمانہ درویشی میں احمدیہ چوک میں ایک چھوٹی سی منیاری کی دکان پر ایک سفید ریش بزرگ بیٹھے رہتے تھے۔ سیاہ چشمہ لگائے۔ ایک کان پر ہاتھ رکھے اپنے کمسن گاہکوں کے ساتھ بہت بلند آواز میں باتیں کرتے تھے۔ یہ کمسن گاہک سکول کے بچے بچیاں ہوتے۔ کاغذ۔ کاپی۔ قلم۔ دوات۔ پنسل وغیرہ کی گاہکی ہوتی۔ ایک مقدس سا بڑھاپا دن بھر میں درجنوں مرتبہ دکان کے اندر چکر لگاتا۔ ایک معمر سی کمر جھکی جھکی دکان کے اندر گھومتی اور یہ شغل صبح سے شام تک جاری رہتا۔ اور ۲۱ سال جاری رہا۔ تا آنکہ اعصاب نے عزم کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا۔

یہ ہمارے بزرگ درویش حضرت بھائی شیر محمد صاحب تھے۔ جو سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے پرانے صحابہ کرامؓ میں سے ایک تھے۔ آپ قادیان کے قریب دھرم کوٹ رندھاوا کے رہنے والے تھے۔ زمانہ طفولیت میں ہی قادیان آ کر اپنے آقا کے قدموں میں بیٹھ گئے تھے۔ بڑی ہمت اور پامردی کے ساتھ قادیان کی سکونت اختیار کئے رکھی۔ بہت خوددار اور باہمت تھے۔ تقسیم ملک سے قبل مدرسہ احمدیہ کے گیٹ کے سامنے منیاری کی دکان تھی۔ جہاں ہر وقت گاہکوں کا ہجوم رہتا۔ بچوں کو تعلیم سے بہرہ ور کیا۔ ملک تقسیم ہو گیا تو باقی خاندان کو بہ تقاضائے حالات پاکستان بھجوا دیا۔ اور خود اپنے آقا کے در کی دربانی چھوڑنا گوارا نہ کیا۔ جذبہ وفاداری نے کہا ہو گا کہ اے محمدؐ کے شیر! بچپن اور جوانی اپنے آقا کے دروازے پر گزار کر اب کہاں جائے گا؟ چنانچہ درویشی اختیار کی۔ اور اس شان سے اختیار کی صدر انجمن احمدیہ سے کوئی خرچ لینا گوارا نہ کیا۔ احمدیہ چوک میں ایک چھوٹی سی دکان لے کر منیاری کا سامان رکھ لیا۔ اور اپنی جسمانی کمزوری کے باوجود اپنا گزارا خود چلاتے رہے۔ چندوں اور نمازوں میں باقاعدگی۔ کم گوئی۔ خدا سے تعلق

یا خود اپنے کام سے تعلق ساری عمر رہا۔نہ کسی کو ستایا نہ ستائے گئے۔

۷۵۔۸۰ سال کی عمر میں مسجد مبارک کی چھت پر سیڑھیاں طے کر کے جب نماز کو جاتے تو اس بوڑھی جوانی پر رشک آجاتا۔اور اپنی سستیوں پر شرم وندامت کا احساس بیدار ہو جاتا۔

حضرت بھائی جی نے واقعی رسول کریم ﷺ کے اس فرمان کے مطابق زندگی گزاری کہ اس دنیا میں یوں زندہ رہو کہ اپنے آپ کو راہ ملک عدم کا مسافر سمجھتے رہو۔وہ ایسا جینا جئے جس کو ایک قابل تقلید نمونہ سمجھا جا سکتا ہے۔

زندگی کے آخری چند سالوں میں جب بڑھاپے کے ناقابل برداشت بوجھ نے چارپائی کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیا تو حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاضل نے ہم زلفی کی لاج رکھتے ہوئے ان کی خدمت اپنے ذمہ لے لی۔اور متواتر چار سال تک یہ خدمت بجا لاتے رہے۔ جزاہ اللہ احسن الجزاء

۷۵ سال کی عمر میں معمولی سی بیماری نے اتنی نقاہت پیدا کر دی کہ حضرت عزرائیل کا ہاتھ تھامے ۲۴ نومبر ۱۹۷۴ء کو اپنے مولائے حقیقی کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔یوں تو پسماندگان میں ان کے بہت سے عزیز موجود ہیں۔لیکن خوش قسمت ہے وہ انسان جو اپنے تقویٰ۔بلند اخلاق اور اچھی یادوں کو اپنے پیچھے چھوڑ جائے۔اور اس اعتبار سے حضرت بھائی جی ؓ واقعی ایسے خوش بخت انسان تھے۔آپ رضی اللہ تعالیٰ عنہ موصی تھے اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی تھے۔ بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۸ میں دفن ہونے کا شرف حاصل ہوا

(بدر ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ء)

محترم حضرت ڈاکٹر عطر دین صاحب رضی صحابی

جلسہ سالانہ قادیان ۱۹۷۴ء کے دوسرے روز یعنی ۲۷ دسمبر کو درویشی کی ۲۷ سالہ تاریخ کا ایک بڑا دردانگیز حادثہ رونما ہوا۔کیونکہ اس روز ہمارے دو بزرگ صحابی درویش چند گھنٹوں کے وقفہ سے وفات پا گئے۔اور دو جنازے اکٹھے بہشتی مقبرہ روڈ پر سفر آخرت پر جاتے دیکھے گئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون۔

الحاج حضرت ڈاکٹر عطر دین صاحب ؓ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے قدیم صحابہ میں سے تھے۔اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہی قادیان میں رہ کر تعلیم حاصل کی تھی۔۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کو ایک قافلہ میں درویشوں کے زمرہ میں شامل ہونے کے لئے قادیان پہنچے تھے۔اور ساڑھے چھبیس سال تک اپنا عہد درویشی خوش اسلوبی سے نبھا کر فوت ہو گئے۔قد چھوٹا تھا۔مگر جسم کی بنیاد بچپن ہی سے مضبوطی کے ساتھ استوار ہوئی تھی۔اس لئے صحت بڑھاپے میں بھی اچھی رہی۔نوجوانی کی عمر میں جب وہ حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہی قادیان میں زیر تعلیم تھے' فٹ بال کے بہترین کھلاڑی تھے۔قادیان میں حصول تعلیم کے بعد وٹرنری اسسٹنٹ سرجن کا امتحان پاس کر کے سرکاری ملازمت اختیار کر لی۔بمبئی میں ایک لمبے عرصہ تک مقیم رہے۔اور وہاں کی جماعت کے صدر بھی رہے۔

۱۹۶۹ء میں اُن کو اللہ تعالیٰ نے حج بیت اللہ شریف کی سعادت بھی عطا فرمائی۔اُن کے فرزند سعید مکرم ڈاکٹر عبدالحمید صاحب بخاری نے اُن کے لئے اخراجات کا انتظام فرمایا۔جس سے وہ عظیم الشان سعادت سے بہرہ ور ہوئے گویا اللہ تعالیٰ نے اُن کو اپنی برکات سے وافر حصہ دیا۔یعنی حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے صحابی ہونے کا شرف' حج بیت اللہ شریف کی سعادت اور درویشی کی سعادت۔اور کتنا خوش قسمت ہے وہ انسان جس میں یہ تمام سعادتیں جمع ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے انواع واقسام۔رنگ برنگ اور متنوع خوشبوؤں والے پھول درویشی کے اس گلدستہ میں کہاں کہاں سے جمع کر کے سجائے تھے۔لیکن خدائی قانون کے تحت ہی حوادث ومرور زمانہ سے یہ پھول آہستہ آہستہ مرجھاتے چلے گئے۔اور اب یہ احساس شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے کہ درویشوں کی اکثریت اپنا فرض اور سفر طے کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو چکی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے باقی ماندہ درویشوں کو ثبات قدم کے ساتھ خدمت سلسلہ کی توفیق عطا فرمائے۔اور سب کا انجام بخیر ہو۔آمین۔

حضرت ڈاکٹر صاحب مرحوم کا جسم مضبوط تھا۔گو بڑھاپے نے جسم پر اپنے اثرات وارد کئے تھے۔لیکن وہ لاٹھی کے ذریعہ ان اثرات کو بھگاتے رہتے تھے۔اور محلہ احمدیہ کی گلیوں میں چلتے پھرتے نظر آتے تھے۔تا آنکہ زندگی کے آخری چند روز کمزوری غالب آ گئی۔۲۷ دسمبر ۱۹۷۴ء کو

اجل کا پیغام آن پہنچا۔ جلسہ سالانہ پر آئے ہوئے سینکڑوں احباب نے جنازہ میں شرکت کی۔ موصی تھے اور چونکہ قدیم صحابیت کا شرف حاصل تھا' اس لئے بہشتی مقبرہ کے قطعہ خاص صحابہ میں دفن ہونے کی سعادت پائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

(بدر ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ء)

محترم حضرت حافظ عبدالرحمٰن صاحب پشاوری صحابیؓ

محترم حافظ عبدالرحمٰن صاحب پشاوری درویش' قادیان کے پرانے باشندے تھے۔ اُن کے والد محترم احمد جان صاحب پشاوری حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ میں ہی قادیان آگئے تھے۔ حافظ صاحب مرحوم اپنی کمزوریٔ بینائی کی وجہ سے حصول تعلیم سے محروم رہے۔ لیکن قرآن مجید کے کچھ حصے یاد تھے۔ علم تجوید سے کچھ واقف تھے اور قدرت کی طرف سے لحن داؤدی عطا ہوا تھا۔ اس لئے قرآن کریم کی تلاوت مرکزی جلسوں میں بہت عمدہ طریق سے کرنے کی سعادت پایا کرتے تھے۔ اور نظمیں بھی خوش الحانی سے پڑھا کرتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۲۷ء میں جب سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثانیؓ شملہ تشریف لے گئے تو حافظ عبدالرحمٰن صاحب بھی ساتھ تھے۔ شملہ میں ایک کل ہند مشاعرہ منعقد ہوا جس میں بڑے بڑے رؤسا اور نواب شامل ہوئے۔ اس مشاعرے میں حافظ صاحب نے حضورؓ کی نظم

ساغر حُسن تو ہے' کوئی مے خوار بھی ہو

سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ اور سامعین کی فرمائش پر حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی فارسی نظم

"از نور پاک قرآں صبح صفا دمیدہ"

بھی حافظ صاحب نے سنائی۔

ابتدائے زمانہ درویشی سے ہی نظر کی کمزوری کے باوجود اپنی کفالت کا ذمہ لیا۔ اور صدر انجمن احمدیہ پر بار بننا پسند نہ کیا۔ لہٰذا چائے کی دکان کھول لی اور درویشی کے قریباً "بیس سال اسی طرح گزارے۔ نظر کی کمزوری کے ساتھ جب جسمانی کمزوری نے محنت کا کام کرنے سے روک

دیا تو دوکان بند کر دی اور انجمن کے وظیفہ پر گزارہ رہا۔

دارالمسیح کے اندر قیام تھا۔ حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب کی ہمسائیگی تھی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حافظ صاحب کو یہ توفیق دی کہ وہ اس خاندان کی خدمت کرتے رہے ہیں اور کئی سال تک یہ خدمت بڑی خوش اسلوبی سے بجالاتے رہے۔ اور حضرت صاحبزادہ صاحب نے بھی کمال شفقت سے حافظ صاحب کے طعام وآرام کا خیال رکھا۔ اور علاج میں بھی کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا۔ لیکن مرض نے بڑھاپے اور نقاہت کے ساتھ مل کر مرض الموت کی شکل اختیار کر لی اور آخر ۱۵ دسمبر ۱۹۷۴ء کو محفلوں اور جلسوں میں اپنے لحن داؤدی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت اور نظمیں اور نعتیں پڑھ کر تجوید وترنم کی داد پانے والا یہ پھول مرجھا گیا۔

اور اب جبکہ درویشوں کی بیشتر تعداد گلشن احمد کی شاخوں میں اپنے آخری دنوں تک چہچہانے کے بعد سرخروئی کے ساتھ اپنے آقا کے حضور حاضر ہو گئی ہے۔ اور وقت کی بادِ صرصر باقی پھولوں پر اثر انداز ہے تو ہم دعا کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو بھی خلوص و وفا کے ساتھ سلسلہ عالیہ کی خدمت بجالانے کی توفیق کے ساتھ زندہ رکھے اور انجام بخیر کرے۔ اللّٰھم آمین

(بدر ۱۳ مارچ ۱۹۷۵ء)

محترم حضرت چوہدری حسن دین صاحب

وَمَنْ نُعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ کا عمل جاری ہے...... اور كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کی حقیقت بھی ہر آن کارفرما ہے اور اس معمورۂ ہستی میں آنے والا ہر ذی روح انہی حقائق میں سے گزر کر اپنے وقت مقرر پر عدم آباد کی راہ لیتا ہے۔ اس سلسلہ آمد وشد سے نہ کسی کو مجال انکار ہے اور نہ کوئی مفر۔

قریباً سوا ستائیس سال قبل ۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کو جو قافلہ احمدیت کے دائمی مرکز قادیان کی خدمت کا عزم استوار لے کر رتن باغ لاہور سے یہاں پہنچا تھا اس میں چند معمر صحابہؓ بھی تھے جو اپنے پیارے آقا سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کے ارشاد گرامی کی تعمیل میں دارالامان میں پہنچے تھے۔ انہی میں سے ایک چوہدری حسن دین صاحب صحابی بھی تھے جو درویشی کی سعادت

پانے کے لئے محض رضائے الٰہی کے حصول کی خاطر اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر یہاں آ گئے تھے۔ منحنی سا قد و قامت۔ نحیف جسم اور سانولی رنگت۔ خاموش طبع۔ دعا گو اور تنہائی پسند۔ انہی اوصاف کے ساتھ وہ طویل عرصہ تک درویشانہ خدمات بجالاتے رہے۔ تا آنکہ ان کے ایک پاؤں میں پھوڑا نکلا جو مزمن ہوتا چلا گیا اور آخر جب ناسور کی شکل اختیار کر گیا تو ڈاکٹروں نے اسے ناقابل علاج قرار دے کر ٹانگ کٹوا دینے کا مشورہ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ مشورہ قبول کرنے کا تصور ہی بہت اذیت ناک تھا۔ چنانچہ وہ ناسور کا درد برداشت کرتے رہے۔ لیکن کٹوانے پر آمادہ نہ ہو سکے۔ پھر شاید ٹانگ کٹوانے کے کربناک تصور نے ان کے دل میں وہ درد پیدا کیا کہ ان کے عمق قلب سے در قبول تک پہنچ جانے والی دعائیں نکلیں۔ جو اس کہنہ ناسور کے لئے مرہم بن گئیں۔ اور وہ ناقابل علاج زخم معمولی علاج سے ہی اچھا ہو گیا۔ لیکن ٹانگ میں مستقلاً لنگڑاپن پیدا ہو گیا۔

ایک عرصہ تک چارپائی کے حلیف رہنے کے بعد وہ پھر بیساکھیوں کے سہارے محلہ احمدیہ کے بازاروں میں نظر آنے لگے۔ اور بڑی ہمت کے ساتھ بغرض دعا مزار مبارک حضرت مسیح موعود علیہ السلام تک پہنچنے لگے۔ جب ٹانگ میں ذرا توانائی آئی تو بیساکھیوں سے نجات مل گئی۔ اور ایک چھڑی کے سہارے چلتے پھرتے رہے۔

چوہدری صاحب بڑے صابر و شاکر۔ قانع اور سادہ طبع انسان تھے۔ حضرت نواب محمد علی خان صاحب کے شہر والے مکان کے ایک کمرے میں قریبا" بارہ سال تک اپنی تنہائی کی صحبت میں مقیم رہے۔ جب تک جسمانی توانائی نے ساتھ دیا باجماعت نمازیں مسجد میں ادا کرتے رہے۔ لیکن آخری ایام میں ضعف مانع ہو گیا۔

وفات سے چند روز قبل بیمار ہوئے۔ جسمانی ضعف پہلے ہی تھا بیماری مستزاد ہوئی اور موت کا بہانہ بن گیا۔ چنانچہ ۵-۶-۷۷ کو بعمر ۷۲ سال فوت ہو گئے۔ حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاضل نے جنازہ پڑھایا اور موصی ہونے کی وجہ سے بہشتی مقبرہ کے قطعہ صحابہ نمبر ۸ میں دفن ہوئے۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے اور تمام پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ ان کی اہلیہ اور بچے پاکستان میں ہیں۔ آپ کا اصل وطن موضع بن باجوہ ضلع سیالکوٹ تھا۔

(بدر ۲۱ اگست ۱۹۷۵ء)

محترم محمد احمد صاحب نسیم

۱۱ مئی ۱۹۴۸ء کو ہی لاہور سے قادیان پہنچنے والے قافلہ درویشان میں ایک درویش بھائی محمد احمد صاحب نسیم تھے۔ اُن کا اصل وطن مالابار (کیرالہ) تھا۔ تقسیم ملک سے قبل قادیان میں رہتے تھے۔ تقسیم کے وقت ہجرت کر کے لاہور چلے گئے۔ اور جب قادیان کی خدمت کیلئے درویشی زندگی گزارنے کی تحریک ہوئی تو اُنہوں نے بخوشی اپنا نام پیش کر دیا۔ گو اس قافلہ میں معمر احباب کو ہی شامل کیا جانا تھا اور نسیم صاحب اس وقت نوجوان تھے۔ لیکن چونکہ وہ نوجوانی کے عالم میں ہی سامنے والے دانتوں سے محروم ہو چکے تھے اس لئے انہوں نے اپنی دانتوں سے محرومی کو وجہ جواز بنایا جسے ان کے جذبہ شوق کی وجہ سے تسلیم کر لیا گیا۔ اور وہ قادیان پہنچ گئے۔ یہاں اُن کے حسب حال انہیں احمدیہ شفاخانہ میں کمپونڈر کے فرائض تفویض کیئے گئے۔ جنہیں بڑی سنجیدگی اور خلوص اور محنت کے ساتھ انہوں نے ۲۷ سال تک ادا کیا۔

طبیعت میں سادگی اور انکسار تھا۔ اپنے کام سے کام رہا۔ کم گوئی کا خاصہ اس قدر تھا کہ بالعموم چلتے پھرتے ایک ہاتھ اپنے منہ کے سامنے رکھتے تھے۔ مبادا کوئی لفظ منہ سے پھسل کر گر جائے۔ چھوٹا قد۔ سانولا رنگ۔ موٹی آنکھیں۔ اونچی ناک۔ ٹخنوں سے اوپر پاجامہ۔ سادگی کا یہ مرقع صرف نمازوں کے اوقات میں مسجد کو جاتے نظر آیا کرتا تھا۔ نماز بڑی آہستگی اور وقار کے ساتھ ادا کرتے۔ تشہد میں بیٹھے ہوئے بالکل بے جان معلوم ہوتے۔ یوں جیسے جسم و جان کو خدا کے سپرد کر دیا ہو۔ اور درحقیقت یہی وہ کیفیت نماز ہے جس پر اہل اسلام کو قائم کرنے کے لئے حضرت مسیح موعود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے......!!

چند سال قبل اُن کے گردوں میں انفیکشن ہوئی تھی۔ ڈاکٹروں نے اپریشن کا مشورہ دیا۔ جس سے وہ خائف ہو گئے۔ باوجود اس کے کہ وہ ہسپتال کے کارکن تھے' ان کا دماغ اپریشن

کے تصور کو قبول نہ کر سکا۔ اور وہ بیماری جو اپنی ابتداء میں معمولی تھی بڑھتی گئی۔ اور وہ بیرونی علاج پر قانع رہے۔ اسی اثناء میں وہ اپنی سروس سے ریٹائر ہو کر دوبارہ ملازمت میں آ گئے۔ جس کے لئے انہوں نے اپنی صحت کا سرٹیفکیٹ بھی پیش کیا' لیکن اُن کا متورم چہرہ بتا تا تھا کہ وہ بیماری کے شکنجے میں آ رہے ہیں۔ چنانچہ جون ۷۵ء کے آخر میں مرض نے شدت اختیار کر لی۔ گردوں کی تکلیف بڑھ گئی۔ قادیان کے ڈاکٹروں نے امرتسر لے جانے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ امرتسر وی۔ جے ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔ جہاں علاج کے باوجود مرض مزید شدت اختیار کر گیا۔ اور آخر ۷۵/۷/۲۱ کو ایک بیوہ اور چھ بچے چھوڑ کر ہمارے یہ درویش بھائی ملک عدم کو سدھار گئے۔ بڑی بیٹی کی شادی ہو چکی ہے۔ ایک لڑکا عزیز حمید احمد' صدر انجمن احمدیہ کے خرچ پر چنڈی گڑھ میں انجینئرنگ کی تعلیم پا رہا ہے۔ اور باقی بچے کمسن ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن سب کا حافظ و ناصر رہے۔

مرحوم موصی تھے۔ ۷۵/۷/۲۲ کی صبح کو بہشتی مقبرہ کے قطعہ ۹ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ اُن کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا فرمائے آمین۔

(بدر ۲۱ اگست ۱۹۷۵ء)

محترم مولوی برکات احمد صاحب راجیکی مرحوم

یہ ہیں گلدستہ درویشان کے ایک اور مہکتے' خوشبوئیں پھیلاتے اور دل و نگاہ کو اپنی طرف کھینچ لینے والے ایک اور پھول' ایک ایسے پھول جن کے رنگ و نکہت کے بیان کے لئے میرے پاس شایان شان الفاظ نہیں ہیں۔ مجھے بہت دیر تک سوچنا پڑا کہ وہ اسلوب بیان کہاں سے لاؤں جو اس پھول کی تصویر کھینچ سکے۔ لیکن مجھے اعتراف ہے کہ میں ایسا نہ کر سکوں گا۔ کیونکہ یہ پھول گلدستہ میں ایک بہت ہی نمایاں اور بیحد باصرہ نواز ہے۔

مولوی برکات احمد صاحب مرحوم کی عظمت کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ وہ حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی رضی اللہ عنہ کے فرزند ارجمند تھے۔ اور حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کیا بلحاظ عظیم المرتبت صحابی ہونے کے اور کیا بلحاظ تبحر علم کے جماعت کے اندر اتنی معروف و مقبول ہے کہ اس کے بیان کی ضرورت ہی نہیں۔ مولوی برکات

احمد صاحب مرحوم نے اپنے گراں قدر باپ کی علمی صفات اور اخلاق سے وافر حصہ پایا تھا۔ اور ان کی رہائش گاہ ہمیشہ مرجع خواص و عوام رہی کیونکہ وہاں دن رات سلسلہ کی روایات اور عظمتوں کا بیان ہوتا تھا۔ مرحوم کا حلقہ اثر و احباب بہت وسیع تھا۔ اپنوں اور غیروں میں مقبول تھے۔ اور بڑی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

مرحوم نے میٹرک تک تعلیم قادیان کے تعلیم الاسلام ہائی سکول میں پائی اور انٹرمیڈیٹ کا امتحان رندھیر کالج کپورتھلہ میں پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ آپ نے سرکاری ملازمت اختیار کر لی تھی۔ لیکن سیدنا حضرت مصلح موعود رضی اللہ عنہ کی وقف زندگی کی تحریک پر لبیک کہتے ہوئے سرکاری ملازمت ترک کر دی۔ اور خدمت سلسلہ کے لئے قادیان حاضر ہو گئے۔ اور دوسرے واقفین کے ساتھ دینی کورس پڑھا۔ ۱۹۴۴ء میں نائب ناظر امور عامہ مقرر ہوئے اور ستمبر ۱۹۴۷ء جب حضرت سید زین العابدین صاحب ناظر امور عامہ کی گرفتاری عمل میں آئی تو نظارت امور عامہ میں ان کا مستقل تقرر ہو گیا۔ گو عہدہ نائب ناظر کا رہا۔ لیکن اس نظارت کی تمام تر ذمہ داریاں انہی کے کاندھوں پر رہیں۔

تقسیم ملک کے بعد مرحوم نے اپنی نظارت کی ذمہ داریوں کو اس قدر خوش اسلوبی سے نبھایا کہ یہ انہی کا حصہ تھا۔ اس زمانہ کے حالات میں اتنی تلخی اور کشیدگی تھی کہ آج اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ پاکستان سے آنے والے زخم خوردہ غیر مسلموں کے دلوں میں قدرتی طور پر مسلمانوں کے خلاف نفرت کا طوفان تھا۔ ایسے حالات میں ایک طرف درویشوں کی صحیح رنگ میں رہنمائی کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات کی استواری کا کام وہی شخص کر سکتا تھا جو حالات کے عمق پر نگاہ رکھتا ہو اور مزاج کے لحاظ سے اس کے اندر بہت دھیما پن ہو۔ کیونکہ ذرا سی بات بھی حالات کو ناخوشگوار بنا سکتی تھی۔ چنانچہ مرحوم نے بڑی ہی خوش اسلوبی اور اور دور اندیشی کے ساتھ اپنے اس فرض کو ادا کیا۔ اور دو تین سالوں کے اندر ہی غیر مسلموں میں سے ایسے تمام لوگوں کے ساتھ گہرے روابط پیدا کر لئے جن کے متعلق یہ سمجھا جاتا تھا کہ وہ مسلمانوں کا نام سننا بھی پسند نہیں کرتے۔ آج جب ۲۹ سالہ قبل کے ماضی پر نگاہ جاتی ہے تو مرحوم کی یہ انتظامی خوبی بڑی نمایاں ہو کر سامنے آ جاتی ہے۔

گو مرحوم نے دینی تعلیم یا تو تعلیم الاسلام ہائی سکول میں میٹرک تک کے دینی کورس میں پائی تھی یا پھر اس کورس میں جو واقفین زندگی کے لئے مقرر تھا۔ لیکن حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کا فرزند ہونے کے لحاظ سے جو تعلیم انہیں اپنے گھر میں ملی تھی اس کا درجہ بہت بلند تھا۔ پھر چونکہ فطری طور پر ذوق مطالعہ رکھتے تھے اس لئے ان کے علم میں بھی اور معلومات دینی و دنیوی میں بھی بہت وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ سلسلہ احمدیہ کی تاریخ سے بہت آگاہی تھی۔ اور سیدنا حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے مبارک زمانہ اور پھر خلفائے عظام کے مبارک دور کے حالات وہ بڑی ہی محبت کے ساتھ سنایا کرتے تھے۔ اُن کے بیان میں خلوص بھی تھا اور دلآویزی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ درویشوں کی ایک بڑی تعداد مرحوم کے پاس ہمہ اوقات موجود رہتی تھی۔ مرحوم ایک عرصہ تک مجرد رہے۔ لیکن مرحوم کے اس تجرد کا فائدہ بہت سے درویشوں کو اس رنگ میں پہنچا کہ مرحوم کی قیام گاہ (حضرت مرزا بشیر احمد صاحبؓ کے مکان کا مردانہ حصہ) پر تذکار علمی کے لئے پہنچ جایا کرتے تھے۔

مرحوم کے پاس علمی کتابوں کے علاوہ ادبی کتب کا بھی ایک ذخیرہ تھا۔ مطالعہ کی وسعت نے اُن کے علم میں ایک رعب اور بیان میں شوکت پیدا کر دی تھی۔ گو اپنی اعصابی کمزوری کے باعث مرحوم نے کبھی تقریر نہ کی تھی۔ لیکن خانگی علمی مجالس میں مرحوم کے بیان میں ایک غیر منقطع تسلسل ہوتا تھا۔ اور حالات وواقعات کے بیان کے ملکہ نے مرحوم کے لئے درویشوں کے دلوں میں ایک مقام پیدا کر دیا تھا۔

تقسیم ملک کے بعد جب صدر انجمن احمدیہ کے سامنے بعض کٹھن مسائل ومراحل آئے جن کے لئے حکومت سے طویل عرصہ تک خط وکتابت کرنا پڑی اور صدر انجمن احمدیہ کی جائدادوں کو حاصل کرنے کے لئے اعلیٰ سطح کے افسروں بلکہ آنجہانی پنڈت نہرو کے ساتھ خط وکتابت کرنا پڑی تو اس کی ڈرافٹنگ مرحوم کا ایک یادگار کارنامہ ہے۔ اور نظارت امور عامہ کی فائلیں اس پر گواہ ہیں۔

گو خاکسار مرحوم کے سامنے ایک طفل مکتب سے بھی کم تر حیثیت رکھتا تھا۔ لیکن ادبی مسائل میں مجھ سے اکثر گفتگو فرمایا کرتے تھے۔ علامہ اقبال کے بعض اشعار زیر بحث رہا کرتے

تھے۔ چنانچہ علامہ اقبال کا یہ شعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے۔
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

سنا کر پوچھا کہ اس کا مفہوم متبادر نہیں ہے۔ ہزاروں سال کا مبالغہ ایک استحالہ عقلی ہے۔ میں نے اس کا جو مفہوم بتایا وہ اس پر بہت مطمئن اور خوش ہوئے (یاد رہے کہ علامہ اقبال کے کئی ایسے اشعار پر تنقید نگاروں نے سخت تنقیدیں کی ہیں)۔

یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ میں عرض کر رہا تھا کہ مولوی برکات احمد صاحب مرحوم بے شمار علمی، ادبی اور اخلاقی خوبیوں کے مالک تھے۔ اُن کی گفتگو کے انداز کی نرمی مخالف سے مخالف تر آدمی کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ اور مدلل اور مفصل اسلوب بیان میں یقین کی ایک کیفیت پائی جاتی تھی۔ مطالعہ کی وسعت نے مرحوم کی شخصیت کے اندر ایک امتیاز پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ درویشی کے ابتدائی دور میں جب ۱۹۵۲ء میں قادیان سے ایک ہفت روزہ اخبار نکالنے کی تجویز ہوئی تو سیدنا حضرت مصلح موعودؓ کی نگاہ انتخاب نے مرحوم ہی کو چنا۔ چنانچہ ۱۹۵۸ء تک اس کے ایڈیٹر رہے۔ اور یہ خدمت آنریری طور پر بجا لاتے رہے۔

بڑے صائب الرائے انسان تھے۔ اس لئے صدر انجمن احمدیہ کی ممبری کے علاوہ وقف جدید انجمن احمدیہ کے بھی ممبر رہے۔ اصلاحی کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے بھی عرصہ تک خدمت انجام دی۔

مرحوم نے اپنے قابل فخر والد حضرت مولانا غلام رسول صاحب راجیکی کے نہایت ایمان افروز حالات کئی جلدوں میں شائع کر کے جماعت کی ایک بڑی خدمت انجام دینے کے علاوہ اپنے باپ کا حق بھی ادا کیا ہے۔ حضرت مولانا راجیکی صاحبؓ کے یہ حالات زندگی اتنے ایمان افروز اور اتنے وجد آفریں ہیں کہ دلوں کے زنگ کو دور کرتے ہیں۔ اور سلسلہ کے ساتھ عشق اور والہیت پیدا کرتے ہیں۔

مرحوم کی شادی ایک لمبے عرصہ کے تجرد کے بعد محترم مرزا برکت علی صاحب آف ابادان ایران (داماد حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانیؓ) کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اولاد

نرینہ سے بھی نوازا۔لیکن بوجوہ یہ شادی کامیاب نہ ہوسکی۔اور خلع ہوگیا۔مرحوم کی دوسری شادی ابھی زیرتجویز تھی۔نکاح بھی ہوچکا تھا۔لیکن اچانک پیغام اجل آگیا اور ۱۷ نومبر ۱۹۶۳ء کو مرحوم حرکت قلب بند ہوجانے سے وفات پاگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔مرحوم کے فرزند عزیز امتیاز احمد اس وقت ربوہ میں ہیں۔

مرحوم کا قد میانہ، جسم بھاری بھرکم تھا۔آنکھیں موٹی اور دل کشادہ تھا۔صدقہ وخیرات اور غرباء کی مدد ہمیشہ شیوہ رہا۔اعصابی کمزوری کے باعث ہاتھوں میں لرزہ تھا۔جس کا اثر ایک ٹانگ پر بھی کبھی کبھی ہوجاتا تھا۔مرحوم موصی تھے۔بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں تدفین عمل میں آئی۔

محترم چوہدری عبدالحمید صاحب آڑھتی مرحوم

وہ کس قدر مسرور ہوں گے۔وہ کتنے ہشاش بشاش ہوں گے۔بڑی ہی عمدہ صحت تو وہ لے کر ہی گئے تھے۔لیکن اپنے بچھڑے ہوئے لخت ہائے جگر اور اپنے عزیزوں سے مل کر کس قدر سرخ وسپید رنگت لے کر آئیں گے۔وہ اپنے پیارے آقا سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ سے لنڈن میں ملاقات کے شرف سے مشرف ہوکر آئیں گے اور تمام درویش اپنے ایک درویش بھائی کی زبانی اپنے پیارے امام کی عمدہ صحت کی خوش خبری پائیں گے ایک عینی شہادت ہوگی جو پیارے امام کی صحت کے بارے میں ہمارے قلوب کو طمانیت بخشے گی۔انگلینڈ اور یورپ کے بعض ممالک کو انہوں نے پہلی بار دیکھا ہوگا۔وہ اپنے بیٹے عزیز عبدالسمیع صاحب سے ڈنمارک میں ملے ہوں گے۔اور بتائیں گے کہ وہ کئی سالوں کے بعد اپنے جگر کے ٹکڑے سے مل کر کتنے مسرور ہوئے تھے۔وہ اس ملک کے حالات بھی سنائیں گے۔انہوں نے اپنے دوسرے بیٹے عزیز عبدالباری صاحب سے بھی ڈنمارک میں ملاقات کی ہوگی۔اس ملاقات کی بشاشتیں اُن کے چہرے پر کھلی ہوں گی۔وہ مسکرا مسکرا کر بتائیں گے کہ اُن کی بیٹی عزیزہ امۃ اللہ بیگم نے دور دراز کا سفر طے کرکے امریکہ سے لنڈن پہنچ کر ان سے ملاقات کی۔اور وہ کیا کچھ سنائیں گے۔یہ سب تو ابھی پردہ مستقبل کے عقب میں مستور تھا۔اور جس کے سننے کے لئے ہم سب

درویش گوش برآواز تھے۔اُس آواز پر جو ہمارے ایک محترم بزرگ درویش بھائی عبدالحمید صاحب آڑھتی کی زبان سے چندروز......صرف چندروز کے بعد نکلنے والی تھی۔اور جس کے اور ہمارے درمیان چار ہزار میل سفر کی دوری تھی۔اور صرف چندروز کا فصل تھا۔

لیکن اچانک ایک روز لنڈن سے تار کے ذریعہ یہ جگرخراش اطلاع ملی کہ مولوی عبدالحمید صاحب آڑھتی کو دل کا دورہ پڑا ہے۔یہ دورہ ۱۲ اکتوبر ۷۶ء کو پڑا۔اُن کے ایسی صحت کے آدمی کو دل کا دورہ پڑجانا ایک ناقابل یقین سی بات تھی۔کیونکہ گو وہ بڑھاپے کی عمر میں تھے۔لیکن صحت اتنی قابل رشک تھی کہ وہ نوجوانوں سے زیادہ نوجوان تھے۔اس سے قبل انہیں کبھی کوئی عارضہ لاحق ہوا ہوتو ہوا ہو کسی شدید بیماری میں وہ مبتلا نہ ہوئے تھے۔ایک نہایت عمدہ صحت کے ساتھ اب تک کی تمام زندگی میں وہ خوش وخرم رہے۔اللہ تعالیٰ نے انہیں اولاد اور اچھی اولاد کی نعمت سے بھی نوازا تھا۔اور زندگی کی تمام آسائشیں انہیں میسر تھیں۔مالی لحاظ سے وہ ہمیشہ فارغ البال رہے۔اور اُن کے بچے بھی خدا کے فضل سے کشادہ دست تھے۔دل کے دورہ کی خبر تھی تو واقعی قابل اعتبار، کیونکہ بڑے ہی ذمہ دار فرد کی طرف سے موصول ہوئی تھی۔لیکن مرحوم کی سابقہ صحت کے مدنظر اس خبر پر یقین کرنے کو جی نہ چاہتا تھا۔کیونکہ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ اپنی تندرستی اور توانائی کے ساتھ ہزاروں خوشیاں دل میں بسائے انٹرنیشنل پاسپورٹ پر ولایت کے لئے روانہ ہوئے تھے۔

لیکن ۱۳ اکتوبر کو انہیں دوبارہ دل کا شدید دورہ پڑا۔لنڈن جیسے ترقی یافتہ شہر میں ہر قسم کی طبی امداد انہیں میسر آئی۔اپنے احمدی اور انگریز ڈاکٹروں نے بڑی توجہ سے ہر ممکن علاج کیا۔لیکن ۱۵ اکتوبر ۷۶ء کو تقدیر کا نوشتہ پورا ہوا۔اور اُن کی روح قفس عنصری سے پرواز کرکے وہاں پہنچ گئی جہاں ہم سب کی روحوں نے بہرحال ایک دن جانا ہے۔

ہم درویشوں کو ایک حسرت تو یہ رہ گئی کہ ہم اُن کی زبانی اُن کے سفر کے حالات سننے کا جو انتظار کررہے تھے وہ انتظار ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا۔اور اس سے بھی بڑی حسرت یہ رہ گئی کہ ہم اُن کی بیماری کے ایام میں اُن کی کوئی خدمت بھی سوائے دُعاؤں کے بجا نہ لاسکے۔لیکن ہماری دعاؤں پر بھی تقدیر غالب آگئی۔اور قضا اپنا کام کرکے رہی

قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہئے!

لیکن ہم اپنے اس مخلص بھائی کی وفات پر اسلامی تعلیم پر عمل کرتے ہوئے یہی کہتے ہیں کہ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اے خدا! ہم تیری رضا پر راضی ہیں۔

مرحوم میانے قد' اور دوہرے جسم کے خوبصورت خدوخال کے آدمی تھے۔ چہرے پر شگفتگی' لبوں پر تبسم اور بشرے پر نور نے ہمیشہ ہم سب کو متاثر کیا۔ سادگی اُن کی ایک اخص خاصیت تھی۔ سفید تہ بند۔ سفید قمیص۔ سفید پگڑی اور دیسی جوتے میں ملبوس وہ شخص ہمارے ساتھ ۲۹ طویل سال گزار کر ہمیں اپنی نیک طینت اور سادگی سے متاثر کرتا رہا...... لباس کے ساتھ ہی داڑھی مونچھوں کی سفیدی نے اُن کے اندر ایک کشش اور جاذبیت رکھی تھی۔

مرحوم کے بیٹوں نے جو خدا کے فضل سے سب کے سب فارغ البال ہیں' مرحوم کو کئی بار دعوت دی کہ آپ بوڑھے ہو چکے ہیں ہمارے پاس چلے آئیں۔ تا کہ ہم آپ کی خدمت کا حق ادا کرسکیں۔ لیکن مرحوم کا جواب بڑا ہی ایمان افروز ہوا کرتا تھا۔ مرحوم کا جواب یہ تھا کہ بیشک اگر میں تمہارے پاس آجاؤں تو تم میری خدمت کرسکو گے۔ لیکن جو عہد میں نے قادیان کی خدمت کے لئے دم واپسیں تک اپنے خدا سے کر رکھا ہے وہ میں بہر حال پورا کروں گا اور ہم تمام درویش اس امر کے گواہ ہیں کہ مرحوم نے بڑی ہی وفاداری' بڑی ہی دینداری اور بڑے ہی اچھے رنگ میں اس عہد کو نبھایا۔ اور اپنے بیوی بچوں سے ۲۹ سال جدا رہ کر شعائر اللہ کی خدمت کی سعادت پائی۔

مرحوم کو کبھی کسی نے نچلے بیٹھے نہیں دیکھا۔ اپنی ساری درویشی میں مرحوم نے کوئی نہ کوئی کام کیا۔ اور سینکڑوں ہزاروں کمائے۔ کئی سال قبل مرحوم نے آڑھت کی دکان منڈی قادیان میں کھولی تھی۔ اسی نسبت سے مرحوم کا نام مولوی عبدالحمید صاحب آڑھتی مشہور ہو گیا تھا۔ اور جب کہیں ذکر ہوتا مرحوم کے نام ساتھ آڑھتی کا لفظ ضرور بولا جاتا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے آڑھت کا کام تو چھوڑ دیا تھا لیکن تجارتی کاروبار جاری رکھا۔ گندم اور چاولوں کے موسم میں مرحوم کئی کئی ہفتوں تک سائیکل پر قادیان کے مضافات میں جاتے۔ اور اناج خرید کر لاتے چنانچہ درویشوں کو بعض مخیّر دوستوں یا صدر انجمن احمدیہ کی طرف سے سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے ماتحت گندم دی جاتی ہے۔ اس گندم کا بیشتر حصہ مرحوم ہی سپلائی کیا

کرتے تھے۔

مرحوم کی دکان اور رہائش گاہ ایک ہی تھی۔ یعنی مسجد مبارک کے بڑے آہنی گیٹ سے متصل وہ دکان جو کسی زمانہ میں حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحبؓ قادیانی کی دودھ دہی کی دکان ہوا کرتی تھی۔ لیکن دکان صرف دن کا بسیرا تھا۔ ورنہ مرحوم ہمیشہ مسجد اقصےٰ میں سویا کرتے تھے۔ مسجد سے انہیں خاص لگاؤ تھا۔ وہیں تہجد کی نماز ادا کر کے صبح کی اذان اکثر دیا کرتے۔ ان کے لحن میں ایک خاص اثر تھا۔ نماز پڑھتے وقت انہیں ہمیشہ قیام کی حالت میں جھومتے ہوئے دیکھا گیا۔ جیسے وہ خدا کی ہمکلامی سے ایک حظ اور لطف پا رہے ہوں۔

انہوں نے بیشک ہزاروں کمایا لیکن حق یہ ہے کہ وہ ہر قسم کے چندے بھی بڑی کشادہ دلی سے دیتے تھے۔ حصہ آمد کے علاوہ تمام طوعی چندوں میں مرحوم اپنے وعدوں کی ادائیگی بروقت کیا کرتے تھے۔ اور السابقون الاولون کی فہرست میں ان کا نام ہوتا تھا۔ چنانچہ مرحوم نے صدسالہ احمدیہ جوبلی فنڈ میں ابتداء میں =/۳۲۰۰ روپے کا وعدہ کیا لیکن بعد میں اسے بڑھا کر -/۴۸۰۰ روپے کردیا۔ اس شخص کی خوش قسمتی پر کیوں ناز نہ کیا جائے کہ مرحوم نے اپنے وعدہ کی تمام رقم سفر یورپ پر روانہ ہونے سے قبل ادا کردی تھی۔ اور شاید اللہ تعالیٰ کو مرحوم کی یہی ادا پسند آئی اور مرحوم کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ لنڈن میں سیدنا حضرت خلیفۃ المسیح الثالث ایدہ اللہ تعالیٰ بنصرہ العزیز نے ان کا جنازہ پڑھایا۔ اور پھر یہ اعزاز کیا کم ہے کہ سیدنا حضور انور نے ان کے متعلق فرمایا کہ:

''ہم اس درویش کا جنازہ قادیان پہنچائیں گے؟''

......جس نے ۲۹ سال اپنے اہل وعیال اور ہر طرح کے آرام کو چھوڑا لیکن شعائر اللہ کی حفاظت کی خاطر قادیان چھوڑنا گوارا نہ کیا اس کی نعش قادیان سے باہر کس طرح دفن ہوسکتی تھی......پس حضور نے ارشاد فرمایا کہ مرحوم کی میت کو قادیان پہنچایا جائے۔ چنانچہ مرحوم کے بیٹوں کو اللہ تعالیٰ نے توفیق دی کہ ہوائی جہاز کے ذریعہ مرحوم کے تابوت کو انہوں نے قادیان پہنچایا۔ اور مرحوم کے فرزند عزیز چودھری غلام احمد صاحب ۱۶ اکتوبر کو میت کے ساتھ یہاں پہنچے اور تابوت اس قسم کا بنوا کر لائے کہ اوپر کے حصہ میں مرحوم

کے چہرے کے اوپر شیشہ لگا ہوا تھا اور اس طرح ہم سب درویشوں نے اپنے پیارے درویش بھائی کا آخری دیدار بھی کر لیا۔

مرحوم موصی تھے۔ بہشتی مقبرہ کی چار دیواری کے اندر واقع تاریخی اور متبرک جنازہ گاہ میں مرحوم کا جنازہ درویشوں کی اکثریت سمیت حضرت مولانا عبدالرحمٰن صاحب فاضل امیر مقامی نے پڑھایا۔ اور مرحوم کو بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں سپرد خدا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے درجات کو بلند فرمائے اور مرحوم کے تمام متعلقین کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین

(بدر ۲۵ نومبر ۱۹۷۶ء)

مکرم نواب خاں درویش مرحوم

ہمارے ایک درویش بھائی مکرم نواب خاں صاحب مرحوم چند ہفتے قبل ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے ہیں۔ مرحوم ضلع گجرات کے کسی گاؤں کے رہنے والے تھے۔ اور تقسیم ملک سے قبل قادیان میں دیہاتی مبلغین کلاس میں تعلیم پاتے تھے۔ تقسیم ملک کے بعد وہ خدمت مرکز کے جذبہ سے سرشار ہو کر قادیان میں ہی مقیم رہے۔ چونکہ دیہاتی مبلغ کا کورس پورا نہ کر سکے تھے اس لئے وہ مختلف دفاتر میں دفتری کی خدمت بجا لاتے رہے۔ بہت ہی سادہ اور کم گو انسان تھے۔ مرحوم کی بیوی پاکستان میں تھی جو ۱۹۵۵ء میں یہاں آ کر چند سال مرحوم کے ساتھ رہی لیکن شومئی قسمت سے تعلقات زوجیت میں رخنہ پڑ گیا۔ اور مرحوم کی بیوی پاکستان چلی گئی۔ اور وہاں جا کر خلع لے لیا۔

مرحوم سادہ اور کم گو تو پہلے ہی تھے۔ بیوی کے خلع لے لینے کے بعد مرحوم کو یہ صدمہ گویا آسیب کی طرح چمٹ گیا۔ کوئی سوسائٹی نہ تھی، کسی سے یارانہ نہ تھا۔ دفتری کے طور پر خدمت انجام دینا اور پھر سارا وقت اپنے کمرے میں تنہا گزار دینا۔ مرتے دم تک یہی ان کی خصوصیت رہی۔ اپنے کمرے میں ہی اکثر نمازیں ادا کرتے تھے۔ اور قرآن کریم کی تلاوت بھی کرتے تھے۔ ایسے ہم یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ مرحوم خدا کے سوا کسی سے بولتے نہ تھے۔ البتہ کبھی کبھی وظیفہ کی کمی کے بارہ میں حضرت امیر صاحب یا حضرت صاحبزادہ مرزا وسیم احمد صاحب۔ کے

پاس فریادی کی حیثیت میں آہستہ گوئی کے ساتھ امداد کے طالب ہوتے تھے۔ گو وظیفہ تو انہیں دوسرے مجرد درویشوں کی شرح سے ہی ملتا تھا۔ لیکن اپنی بے حد سادگی کے باعث وہ اس میں گزارہ نہ کر سکتے تھے احمدیہ چوک سے مسجد مبارک کی طرف آئیں تو بائیں ہاتھ ایک چھوٹا سا کمرہ ہے۔ بس یہی کمرہ ان کی قیام گاہ تھی۔ کمرہ بھی خاموش۔ در و دیوار بھی خاموش۔ اور مکین بھی خاموش۔ انہی حدود اور انہی کیفیات میں مرحوم نے کئی سال گزارے۔ اور یوں گزارے کہ جب کبھی وہ سامنے آ جاتے تھے تو یاد آتا تھا کہ نواب خاں بھی یہیں قادیان میں رہتے ہیں۔ ورنہ انہیں اپنی تنہائی سے پیار تھا۔ سردی ہو یا گرمی وہ اپنے اسی کمرے میں سوتے تھے۔

اور پھر ایک صبح جب ان کے انچارج نے دروازہ کھولا تو دیکھا کہ سخت گرمی کے ایام میں وہ اپنی چارپائی پر پہلو کے بل لیٹے ہوئے ہیں۔ ہلایا تو معلوم ہوا کہ جسم اکڑا ہوا ہے۔ وہ رات ہی کے کسی حصہ میں ۱۸ جولائی ۱۹۷۶ء کو حرکت قلب بند ہو جانے سے اپنے رب کے حضور حاضر ہو چکے تھے۔ اسی روز بعد دوپہر مرحوم کا جنازہ مہمان خانہ کے صحن میں حضرت امیر صاحب مقامی نے پڑھایا اور مرحوم کو بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں ابدی نیند سونے کے لئے ایک قبر کی لحد میں رکھ کر مٹی ڈال دی گئی۔ خاموشی سے جانے والے! خدا حافظ۔ پہلے تو اپنے کمرے میں خاموش رہا کرتا تھا اور اب تو شہر خموشاں میں رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تجھے رحمت کی چادر اوڑھا دے۔ آمین

مرحوم سرخ و سپید رنگ کے ساڑھے پانچ فٹ قد کے تھے۔ آنکھوں میں نیلاہٹ تھی۔ سادگی اور خاموشی ان کی امتیازی خاصیت تھی۔

• انا للہ وانا الیہ راجعون

(بدر ۲۵ نومبر ۱۹۷۶ء)

محترم حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم

آہ! ایک اور خوش رنگ پھول کے شجر زندگی کے اوراق موت کی باد سموم سے زرد ہو کر جھڑ گئے۔ اور گلدستہ درویشاں کا حسن ایک جانب سے گہنا کر رہ گیا۔ ہمارے درویش بھائی حافظ عبدالعزیز صاحب اس گلدستہ کے ایک خوشنما پھول ہی نہ تھے وہ اس چمنستان کا ایک خوش نوا بلبل

بھی تھے۔ درویشی بجائے خود ایک سعادت ہے۔ لیکن یہ سعادت حافظ صاحب مرحوم کے لئے اس لحاظ سے دو آتشہ تھی کہ وہ مسجد اقصیٰ کے مؤذن تھے۔ مینارۃ المسیح شاہد ہے کہ حافظ صاحب مرحوم نے متواتر ۲۴ سال کے طویل عرصہ تک روزانہ پانچوں وقت مینار کی ۸۵ سیڑھیاں طے کر کے اپنی خوش گلوئی کے ساتھ اذان کے روحانی اور سرمدی نغمے فضاؤں میں بکھیرے۔ وہ جہیر الصوت بھی تھے اور ان کی آواز میں ایک لے تھی۔ خوش الحانی کے ساتھ جب ان کی آواز مینار کی بلندی پر سے فضاؤں میں گونجتی تو اس کی کیف زائی میں ایک دعوت عبودیت ہوتی۔ یوں تو اذان خود اپنی ذات میں ایک دعوت عبودیت ہے۔ لیکن حافظ صاحب مرحوم کی اذان میں ایک عجیب کشش تھی۔ یوں کہ نمازیون کے قدموں میں مسجد تک پہنچنے کے لئے ایک ارتعاش پیدا ہو جاتا تھا۔

حافظ صاحب مرحوم نابینا تھے۔ غالباً بچپن میں کسی مرض کے حملہ سے وہ بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔ یوں ان کی آنکھیں کانی موٹی تھیں اور کوئی اجنبی انہیں دیکھ کر نابینا نہیں کہہ سکتا تھا۔ کیونکہ آنکھیں اپنے حلقوں میں باقاعدہ گردش کرتی تھیں۔

ابتدائے درویشی میں جب درویشوں کی شادیاں ہوئیں تو حافظ صاحب کے لئے شادی کا کوئی انتظام نہ ہو سکا۔ ان کی نابینائی کے علاوہ آمد کی کمی سدراہ تھی۔ انہیں اپنی بیٹی سپرد کر دینے والے شخص کے اندر بڑے ہی حوصلے اور جرأت کی ضرورت تھی۔ جس کے دل میں قربانی کا بے انتہا جذبہ ہوتا۔ چنانچہ حافظ صاحب نے تجرد کا ایک طویل عرصہ گزارا۔ نابینائی سے قطع نظر حافظ صاحب کی عام جسمانی صحت بہت اچھی تھی اور بعض حساس درویش ان کے طویل تجرد پر افسوس بھی کرتے لیکن ہر کام وقت معینہ کا مرہون ہوتا ہے یہ مسجد اقصیٰ کی مخلصانہ خدمت کا کرشمہ تھا یا حافظ صاحب کے تجرد کی خاموش التجا کہ قدرت ایک ہزار میل کے فاصلے سے ایک مخلص احمدی دوست مکرم مخدوم حسین صاحب کو صوبہ میسور کے گاؤں بیلگام سے قادیان کھینچ لائی۔ وہ تلاش معاش میں قادیان آئے تھے اور ان کے ہمراہ ایک نا کتخدا جوان بچی بھی تھی۔ انہیں جب تحریک کی گئی تو وہ اس قربانی پر آمادہ ہو گئے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ حافظ عبدالعزیز صاحب نابینا اور غریب درویش تھے اور کوئی مؤثر جواز شادی کے لئے نہ رکھتے تھے۔ لیکن آفرین ہے مخدوم حسین صاحب

پر کہ وہ اس بے مثال قربانی پر آمادہ ہو گئے۔ اور پھر آفرین ہے اس نوجوان لڑکی پر بھی جس نے ایک نابینا غریب درویش کی بیوی بننا منظور کر لیا۔ اور پھر شادی کے بعد دس سال تک بڑی وفاداری سے اپنے شوہر کی خدمت کی۔

بہر حال ۱۹۶۴ء میں حافظ صاحب کی شادی ہوئی اور پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد سے بھی نواز۔ ان کے چار بچے ہیں۔ دو لڑکے اور دو لڑکیاں اور سارے بچے گلاب کے شگفتہ پھولوں ایسے......!!

قریباً تین سال قبل حافظ صاحب مرحوم مسجد اقصیٰ میں جھاڑو دے رہے تھے میں نے اپنے دفتر کے دروازے سے (جو مسجد اقصیٰ کی طرف کھلتا ہے) دیکھا کہ حافظ صاحب کا بڑا بیٹا عزیز عبدالرحمٰن ان کے گلے سے چمٹا ہوا تھا۔ حافظ صاحب نے جھاڑو رکھ دیا۔ اور بچے کو چمٹا کر پیار سے اس کے سر اور پشت پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ اس نظارے نے مجھے مسحور بھی کیا اور غمزدہ بھی۔ بچہ نہایت حسین خدوخال کا ہے اور ایک نابینا باپ اس سے ان جانی سی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ میرا دل پکار اٹھا۔

کاش! یہ نابینا باپ اپنے پھول سے بچے کو بھی دیکھ سکتا۔

اے کاش! اس کی بینائی لوٹ آئے۔

جذبات ابل کر میرے سینے کی گہرائی سے اٹھے اور دعا بن کر میرے لبوں پر مچل گئے۔ میں دیر تک اشکبار کھڑا دیکھتا رہا۔ اور غیر ارادی طور پر بار بار یہ الفاظ میرے منہ سے دعا بن کر نکلتے رہے۔ اور پھر انہیں جذبات کے دھارے میں بہتے ہوئے میں نے گلوگیر ہو کر حافظ صاحب کو مخاطب کیا۔

حافظ صاحب! میں دعا کر رہا ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو بینائی بخشے اور آپ اپنے اس خوبصورت ثمر کو دیکھ کر حقیقی مسرت پا سکیں۔ اس کے بعد جب کبھی حافظ صاحب مجھے نظر آتے' وہ نظارہ میرے سامنے آ جاتا اور میں ان کی بینائی کے لئے دعا کرتا۔ لیکن مجھ کمزور اور گنہگار۔ انسان کی دعا باب اجابت تک نہ پہنچ سکی۔ اور حافظ صاحب اپنی نابینائی سمیت ہم سب درویشوں کو مغموم کر کے اپنے مالک حقیقی کے پاس پہنچ گئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حافظ صاحب بڑی لگن کے ساتھ اس مسجد اقصیٰ کی خدمت کرتے تھے جو شعائر اللہ میں سے ایک ہے۔ وہ روزانہ بلا ناغہ اس وسیع و عریض مسجد میں جھاڑو دیتے۔ اور ساتھ ساتھ ہاتھ سے فرش کو ٹٹولتے جاتے کہ کہیں کوئی تنکا تو پڑا نہیں رہ گیا۔ وہ ساری دریوں کو بھی جھاڑتے اور نابینائی کے باوجود صفیں سیدھی بچھاتے۔ مسجد کا ایک ایک کونہ ایک ایک چپہ۔ ایک ایک بلب اور سوئچ ان کے حافظے میں موجود ہوتا۔ یہی نہیں بلکہ محلّہ احمدیہ کا ایک ایک گوشہ ان کے حافظہ کی گرفت میں تھا انہیں اگر کوئی اجنبی اس محلے میں چلتے پھرتے دیکھتا تو بتانے کے باوجود اس کے لئے یہ باور کرنا مشکل ہوتا کہ حافظ صاحب نابینا ہیں۔ ان کے قدموں نے اپنے ایریا کی ایک ایک اینٹ ناپی اور حفظ کی ہوئی تھی۔ اپنی تیز رفتار کے ساتھ وہ گلیوں کے موڑیوں کاٹ جاتے اور نالیوں پر سے یوں گزر جاتے جیسے وہ بالکل صحت نظر کے ساتھ چل رہے ہوں۔

چند ماہ قبل تک حافظ صاحب کی صحت بہت عمدہ تھی۔ لیکن اچانک کسی بیماری کے حملہ سے وہ فریش ہوئے۔ بیماری کی پیچیدہ نوعیت نے ڈاکٹروں کو صحیح تشخیص تک نہ پہنچنے دیا۔ اور وہ نڈھال ہوتے چلے گئے۔ وفات سے چند روز قبل امرتسر کے وی۔ جے ہسپتال میں داخل کروایا گیا۔ مگر اس اثناء میں مرض اپنا بھرپور وار کر چکا تھا۔ بدن میں خون اور پانی کی کمی اور پھیپھڑوں کے متاثر ہو جانے کے باعث دوائیں بے اثر ہو گئیں۔ اور آخر ۲۰ فروری ۱۹۷۳ء کو وہ زندگی کی سرحد عبور کر کے موت کی وادی میں داخل ہو گئے۔ بیوی اپنے مشفق شوہر کو صحت مند دیکھنے کی آرزو دل میں لئے بیوہ ہو گئی۔ اور گلاب کے سے شگفتہ پھولوں ایسے چار بچے اپنے محبت کرنے والے نابینا باپ کے پیار بھرے ہاتھوں کے لمس سے محروم ہو گئے۔ اور درویشوں کا یہ مختصر سا ماحول افسردہ و غمگین ہو گیا۔

حافظ صاحب مرحوم ننگل باغباناں متصل قادیان کے رہنے والے تھے بڑی خاموشی اور وفاداری کے ساتھ اپنے عہد درویشی کو نبھا کر ۵۰ سال کی عمر میں داعی اجل کو لبیک کہہ کر بہشتی مقبرہ کے قطعہ نمبر ۹ میں دفن ہوئے۔ اللہ تعالیٰ مغفرت فرمائے۔

(بدر مارچ ۱۹۷۳ء)

☆..........☆..........☆

اہل قادیان کے نام پیغام

از حضرت سیدہ نواب مبارکہ بیگم صاحبہ مدظلہا العالیٰ

خوشا نصیب کہ تم قادیاں میں رہتے ہو
دیار مہدی آخر زماں میں رہتے ہو
قدم مسیحؑ کے جس کو بنا چکے ہیں "حرم"
تم اس زمین کرامت نشاں میں رہتے ہو
خدا نے بخشی ہے "الدار" کی نگہبانی
اُسی کے حفظ، کسی کی اماں میں رہتے ہو
فرشتے ناز کریں جس کی پہرہ داری پر
ہم اس سے دور ہیں تم اس مکاں میں رہتے ہو
فضا ہے جس کی معطر نفوس عیسے سے
اسی مقام فلک آستاں میں رہتے ہو
نہ کیوں دلوں کو سکون و سرور ہو حاصل
کہ قرب خطہ رشک جناں میں رہتے ہو
تمہیں سلام و دعا ہے نصیب صبح و مسا
جوار مرقد شاہ زماں میں رہتے ہو
شبیں جہاں کی "شب قدر" اور دن عیدیں
جو ہم سے چھوٹ گیا اس جہاں میں رہتے ہو
کچھ ایسے گل ہیں جو پژمردہ ہیں جدا ہو کر
انہیں بھی یاد رکھو "گلستاں" میں رہتے ہو
تمہارے دم سے ہمارے گھروں کی آبادی
تمہاری قید پہ صدقے ہزار آزادی
"بلبل ہوں صحن باغ سے دور اور شکستہ پر
پروا نہ ہوں چراغ سے دور اور شکستہ پر"

اعتذار

اس مجموعہ میں ۵۷ قابل احترام درویش بھائیوں کے حالات شائع کئے جارہے ہیں۔ بہت سے درویشوں کے حالات جو بدر میں شائع ہو چکے ہیں، تلاش کے باوجود نہیں مل سکے۔ وہ انشاء اللہ دوسری جلد میں شائع کر دیئے جائیں گے۔ وباللہ التوفیق

خاکسار فیض احمد گجراتی درویش

ھدیہ تشکر

ان قابل احترام درویشوں کے حالات کتابی صورت میں شائع کرنے کے لئے جو اپنا عہد درویشی وفاداری کے ساتھ نبھا کر اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو گئے۔ محترم برادرم سید محمد نور عالم صاحب امیر جماعت احمدیہ کلکتہ کی تحریک پر عزیز محترم ظفر احمد صاحب سلمہ ابن سیٹھ محمد حسین صاحب نے اخراجات کا انتظام فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اپنی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے۔ آمین

خاکسار فیض احمد گجراتی درویش



حضرت بھائی عبدالرحمٰن صاحب قادیانی ؓ



حضرت حاجی محمد الدین صاحب تہالوی ؓ



حضرت بابا سلطان احمد صاحب ؓ



حضرت بابا صدرالدین صاحب ؓ



حضرت میاں محمد عبداللہ صاحب افغان ؓ



حضرت بابا بھاگ صاحب امرتسری ؓ



حضرت حافظ صدرالدین صاحب ؓ



حضرت بابا عبدالسبحان صاحب ؓ



حضرت بابا غلام محمد صاحب سیالکوٹی



محترم شیخ محمد یعقوب صاحب چنیوٹی مرحوم چادر اوڑھے
ساتھ محترم سیٹھ محمد صدیق صاحب بانی مرحوم کھڑے ہیں



محترم بابا خدا بخش صاحب قلفی مرحوم



محترم دفعدار محمد عبداللہ صاحب مرحوم



محترم بابا نور احمد صاحب باورچی مرحوم



محترم یونس احمد صاحب اسلم مرحوم



محترم چودھری محمد عبداللہ صاحب لائلپوری مرحوم



محترم بابا بھاگ صاحب قادیانی مرحوم
ہاتھ میں پنکھا لئے۔



محترم بشیر احمد صاحب سندھی مرحوم



محترم سید منظور احمد صاحب عاقل مرحوم



محترم محمد عزیز صاحب گجراتی مرحوم



محترم بابا جان محمد صاحب سیالکوٹی مرحوم



محترم شیخ غلام جیلانی صاحب مرحوم



محترم فضل الٰہی صاحب گجراتی مرحوم



محترم عبدالرحیم صاحب افغان مرحوم



محترم میاں سلطان احمد صاحب مرحوم کھاریاں



محترم عبد الاحد خاں صاحب افغان مرحوم



محترم بابا محمد الدین صاحب مرحوم



محترم حکیم عبد الرحیم صاحب مرحُوم



محترم میاں مجید احمد صاحب ڈرائیور مرحوم



محترم عبد الرحیم صاحب ملکانہ مرحُوم



محترم بابا جلال الدین صاحب مرحوم



حضرت بھائی شیر محمد صاحب قادیانی رضؓ



حضرت ڈاکٹر عطر الدین صاحب رضؓ



حضرت حافظ عبد الرحمٰن صاحب پشاوری رضؓ



حضرت چودھری حسن دین صاحب رضؓ



محترم مستری عبد الغفور صاحب مرحوم



محترم محمد احمد صاحب نسیم مرحوم



محترم مولوی برکات احمد صاحب راجیکی مرحوم



محترم چوہدری عبد الحمید صاحب آڑھتی مرحوم



محترم نواب خاں صاحب مرحوم



محترم حافظ عبد العزیز صاحب مرحوم